جلد 22 شمارہ 10 ماہ دسمبر 2020ء ربیع الثانی 1442ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

صداقت

اللہ

محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا تعارف اور اغراض و مقاصد

- سلسلہ عالیہ توحیدیہ ایک روحانی تحریک ہے جس کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول، کثرت ذکر مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اس کی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا ہے۔
- حضور ﷺ کے اصحاب کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج ہے۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مختصر اور سہل العمل اوراد واذکار کی تلقین۔
- غصہ اور نفرت، حسد و بغض، تجسّس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا عالمگیر محبّت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا ہے۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا۔ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبّت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے۔

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد
خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

محمد صدیق ڈارؒ
بانی مجلہ فلاحِ آدمیت

نگران و سرپرست اعلیٰ: جناب **محمد یعقوب توحیدی** شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
0344-9000042

مجلس ادارت

مدیر	احمد رضا خان 0321-6400942
نائب مدیر	سید رحمت اللہ شاہ 0333-4552212
معاون مدیر	شہزاد محمود بخاری 0301-7430525

خالد مسعود، وحید احمد
پیر خان، عتیق احمد عباسی
حافظ محمد یٰسین، عبدالقیوم ہاشمی
پروفیسر محمد شبیر شاہد ہوتانی
ماجد محمود توحیدی

ترسیل: **فہد محمود ، محمد ریاض**

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ
مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ) وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph: 055-3411030 ای میل: info@tauheediyah.com
Website www.tauheediyah.com

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

قیمت شمارہ -/30 روپے ✿✿✿ سالانہ فنڈ -/300 روپے

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
دل کی بات	ادارہ	1
نفس کی طاقت	خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ	3
نقوش مہر و وفا	سید رحمت اللہ شاہ	6
اسلام میں اعتدال پسندی	ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ	14
فوجی جوان	حکیم محمد سعیدؒ	18
جوانی اور صحت مند زندگی	محمد انور بن اختر	21
جذبہ انتقام	پیر خان توحیدی	32
حقیقت انسان	کیپٹن واحد بخش سیال	37
جوانی اور صحت مند زندگی	محمد انور اختر	42
حب الٰہی	حضرت شیخ عبدالقادر عیسیٰ	47
عشق رحمت دو عالم ﷺ	عبدالرشید ساہی	52
توکل	امام غزالیؒ	55
اتحاد اہم ترین ضرورت ہے	مولانا اسجد قاسمی	60

دل کی بات

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیمات اگر چہ مختصر مگر نتائج کے اعتبار سے انتہائی سریع الاثر ہیں۔ جو لوگ خلوص نیت اور یکسوہو کر ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں بہت ہی قلیل عرصے میں اپنی منزل مراد پا لیتے ہیں۔ کثرت ذکر خصوصاً پاس انفاس سے جب قلب میں اپنے مالک کی یاد جڑ پکڑ لیتی ہے تو ایسے سالک کے لیے ہر وہ کام آسان ہو جاتا ہے جس کے کرنے کا اللہ حکم دیتا ہے۔ بلکہ اسے خوشی اور سکون حاصل ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آقا کا کہنا مانتا ہے۔ ایسے بندہ مومن پر یہ جملہ صادق آتا ہے کہ ''خدا تک پہنچنا دو قدم ہے ایک نفس پر رکھیں اور دوسرا خدا کے سامنے''۔ شیطان اور نفس اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور وہ حنیف بن کر روز بہ روز خدا کے قرب کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

مذکورہ دعویٰ کی دلیل اس بات سے سمجھیں کہ کس مسلمان کو نہیں پتہ کہ اس زندگی کے خاتمے کے بعد اعمال کی جزا و سزا کی صورت میں جنت و دوزخ ملے گی۔ مگر اس کے باوجود ایک عظیم اکثریت نیک اعمال تو کجا خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض بھی ادا نہیں کرتی بلکہ شیطان کی پیروی پر مصر ہے۔ اس کی وجہ ہر کوئی یہ بتاتا ہے کہ دلوں سے ایمان ختم ہو گیا۔ ایمان کمزور ہے لوگ مرنا بھول چکے ہیں۔ دنیا کی رنگینیوں میں کھو چکے ہیں، رسول کی پیروی نہیں کرتے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بقول غالب

جانتا ہوں ثواب و طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

لیکن اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ ۔کوئی نہیں بتا تا ۔اس کیفیت کا حل ایک سالک بخوبی جانتا ہے ۔وہ اس طرح کہ جب وہ ایک عام آدمی تھا اس وقت تک اس کے لیے شیطان ونفسانی ہتھکنڈوں سے بچنا محال تھا مگر جوں ہی وہ اپنا Target Set کر کے ذکرالٰہی کے قلعے میں آیا ۔اس کا راستہ آسان ہوتا چلا گیا ۔الغرض خدا کی یاد اور اس کو اپنا مقصود بنائے بغیر شیطانی ونفسانی فریب کاریوں سے بچنا ناممکنات میں سے ہے جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے **ان الانسان خلق هلوعا** (انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے)خدا کی یاد اور ذکر وہ نسخہ کیمیا ہے جو اس سے تعلق کی شروعات اور مضبوطی کے نتیجے میں کردار کی مضبوطی کا ضامن ہے اور یہی تعلق ایک عام مسلمان کو مومن ،محسن ومقرب بارگاہ بناتا ہے ۔ایسا شخص ہی **"سمعنا و اطعنا"** کے رویے کا حامل ہوتا ہے ۔

ربّ کریم سے دُعا ہے کہ ہمیں سلسلہ توحیدیہ کی تعلیمات کا حقیقی فہم عطا فرمائے اور اپنے مقربین میں شامل فرمائے ۔ آمین ۔

مدیر فلاح آدمیت

نفس کی طاقت

(خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ)

نفس کی طاقت کا سب سے گھٹیا مظہر ہیں: مسمریزم، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی اور انتقال خیال ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں۔ میرے خیال میں یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مسمریزم اور ہپناٹزم سے بیماریوں کا کامیاب علاج کیا جاتا ہے اور یورپ میں یہ طریقہ علاج بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے سر کا درد، جسم کے کسی اور حصہ کا درد، بخار وغیرہ کو اس کے عمل سے بہت جلد آرام آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مہلک بیماریوں کو بھی شفا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دیوانہ پن بھی جاتا رہتا ہے مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے تصوّف میں بھی یہ طریقہ صدیوں تک جاری رہا ہے۔ نقشبندیہ خاندان میں تو سلب مرض کا طریقہ باقاعدہ سکھایا اور عمل میں لایا جاتا تھا۔ میں نے اس کا بذاتِ خود کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اگر آپ اس سے متعلق کچھ جاننا چاہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''قول الجمیل'' کا مطالعہ کریں۔ اس میں یہ طریقہ مختصر طور پر دیا ہوا ہے۔

مسمریزم کا ایک تماشہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عامل چھوٹی اور ہلکی مادّی چیزوں کو صرف نظر اور انگلی سے اشارہ کر کے متحرک کر دیتا ہے اور وہ چیزیں گز دو گز فاصلہ طے کر کے عامل کے پاس آ جاتی ہیں۔ دیا سلائی، چاقو، گھڑی اور قلم وغیرہ۔ ہپناٹزم میں معمول پر خواب مقناطیسی طاری کر کے اس کے دل کا چھپا ہوا سارا حال پوچھا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ مجرموں سے جرم کا پتہ لگانے کے لیے بہت مفید ہے۔ ٹیلی پیتھی اور انتقال خیال یہ ہے کہ عامل معمول کو مقناطیسی نیند سلا کر اس سے ماحول وغیرہ کے متعلق سوال کرتا ہے اور صحیح جواب پاتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد کے سامنے اسی طرح ایک عامل اپنے معمول کو بے ہوش کر کے طرح طرح کے سوالات پوچھ رہا تھا۔ مثلاً عامل نے ایک آدمی سے گھڑی لی اور معمول سے جو بے ہوش سو رہا تھا

اور جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی پوچھا یہ کیا؟ معمول نے جواب دیا: گھڑی۔ عامل نے پوچھا: کیا بجا ہے؟ معمول نے درست جواب دیا۔ یوں وہ طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا میں نے اپنے ہاتھ میں چونی دبائی اور عامل سے کہا اپنے معمول سے پوچھو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اس پر عامل نے کہا مجھے دکھایئے آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے انکار کیا تو وہ کہنے لگا پھر تو میرا معمول نہیں بتا سکے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ معمول کو صرف اس بات کا علم ہو سکتا ہے جو عامل کو معلوم ہے۔ اسی کو انتقال خیال کہتے ہیں۔

ٹیلی پیتھی یہ ہے کہ عامل و معمول یا دو دوست شہر کے مختلف محلوں میں یا دو مختلف شہروں میں رہتے ہیں وہ ایک وقت مقرر کر کے لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک آدمی کچھ سوالات وغیرہ لکھتا ہے۔ دوسرا بھی بالکل وہی باتیں اپنے کاغذ پر لکھتا ہے۔ پہلا آدمی بھی اس وقت کچھ لکھتا ہے اور اس سے بالکل وہی جواب لکھا جاتا ہے جو نمبر ۲ نے لکھا تھا۔ یہ بھی دراصل انتقال خیال ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی حالت میں آمنے سامنے عمل ہوتا ہے اور اس صورت میں فاصلے سے۔ بادی النظر میں یہ باتیں بڑی معرکۃ الآراء اور حیران کن ہیں۔ لیکن جن صوفیوں نے سلوک میں کمال حاصل کیا ہے ان کے نزدیک یہ سب کچھ بازیچہ اطفال سے زیادہ نہیں۔ ایک صوفی اپنے مریدوں پر توجہ کے ذریعہ جو چاہے وہی اثر ڈال سکتا ہے۔ لاہور میں بیٹھے ہوئے لندن یا نیویارک جیسے دور دراز مقامات میں اپنے مریدوں کے دماغ پر توجہ دے کر ان کی بری عادتیں چھڑا سکتا ہے اور ان کی اصلاح کر سکتا ہے۔ دور بیٹھے ہوئے مریضوں پر صرف خیال اور تصور سے دم کر کے ان کے امراض کو دور کر سکتا ہے۔ جو چاہے وہ پیغام پہنچا سکتا ہے اور اس کا جواب لے سکتا ہے۔ یہ کوئی دور راز کار باتیں نہیں۔ خود میرا اپنا روزمرہ کا تجربہ ہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ ایک مسمرائزر یا ہپناٹسٹ اپنے معمول کو پہلے سے بتا دیتا ہے کہ جو میں کہوں تم بھی اسی کا تصور کرنا اور اپنی قوت ارادی کو میرے سپرد کر دینا۔ اب اگر معمول عامل کے خلاف سوچے اور یہ خیال کرے کہ عامل کا اثر ہرگز قبول نہ کروں گا تو پھر ایسے معمول پر عامل کا

کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ مسلمان صوفی کو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ وہ جس کو چاہے اپنی توجہ سے اس کے خیالات بدل سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

یہ تو تھے مسمریزم وغیرہ کے معمولی کرشمے مگر نفس کی طاقت اس سے کہیں بڑے بڑے کام انجام دے سکتی ہے' مثلاً محض قوت ارادی سے بڑے بڑے بوجھوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینا' مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ ہو جانا' طے الارض یعنی ہزاروں میل کا فاصلہ چند سیکنڈ میں طے کر لینا' شکل تبدیل کر لینا یا لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جانا' کشف سے دل کا حال یا ماضی و مستقبل کا حال بتا دینا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک اور علم نفس سے متعلق ہے جس کو سیمیا کہتے ہیں اس میں یہ ہوتا ہے کہ موجود کچھ ہوتا ہے لیکن نظر کچھ آتا ہے۔ یا موجود کچھ بھی نہیں ہوتا اور عامل جو کچھ دکھانا چاہے وہی نظر آنے لگتا ہے۔

(فرمودات قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدیؒ)

نفس کی رکاوٹ

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان کے بعد قیامت کے دن اور آخرت کی زندگی پر یقین لانا دین اسلام کا اہم ترین ستون ہے۔ قیامت کا دن بہت بھاری ہوگا کیونکہ ہماری پوری زندگی کے سارے اعمال کا حساب ہوگا۔ جن لوگوں نے اللہ کے انبیاءؑ کی اتباع میں زندگی گزار کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لی وہ کامیاب قرار دے کر نعمتوں بھری جنتوں میں داخل کئے جائیں گے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو ٹھکرا کر اپنے نفس کی خواہشات یعنی من مرضی والی زندگی بسر کی اور اللہ کی محبت کی بجائے مادی دُنیا کی محبت میں پھنس کر رہ گئے وہ عبرتناک انجام کو پہنچیں گے۔ اس دن کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ سچے اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے وہ دن تو ضرور آنا ہے۔

(از مقصود حیات)

نقوشِ مہر و وفا

(فرمودات قبلہ بابا جان محمد صدیق ڈار صاحب توحیدیؒ)

(مرتب: سید رحمت اللہ شاہ)

بابا جانؒ سے پوچھا گیا کہ یہ جو سلوک میں روحانی ترقی ہوتی ہے، اس میں جن لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا! ان کے لئے کیا Parameters ہوتے ہیں، اپنی روحانی ترقی کو دیکھنے کے لئے کہ واقعی ترقی ہو رہی ہے؟

بابا جانؒ فرمانے لگے: ''باباجیؒ (حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحبؒ) نے ایک وہ تختی والا واقعہ لکھا ہے۔ باباجیؒ اس کاتب کی مثال دیتے تھے کہ جو لوگ اس کاتب کے پاس کتابت سیکھنے کے لئے داخل ہوتے تھے تو وہ بھی شکایت کرتے تھے کہ پہلے دن جیسے خط تھا، ابھی تک ویسے ہی ہے۔ وہ کاتب سٹوڈنٹ سے تختی لکھواتے کہ لکھو!!! پھر تختی لکھوا کے اس پر اس کا نام لکھ کر Stock میں رکھ دیتے تھے۔ جب کوئی شکایت کرتا کہ خط ابھی اُدھر ہی ہے تو کہتے کہ اچھا لاؤ اس کی تختی۔ وہ خود ہی دیکھتا تو کہتا کہ بہت فرق پڑ گیا ہے۔ اُس وقت تو یہ الف، بے بھی جو ہے یہ ٹیڑھی میڑھی تھی، کوئی اِدھر جا رہا ہے اور کوئی اُدھر۔ روز Improvement جو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہے وہ کہاں دکھائی دیتی ہے۔ گھر میں بچہ ہو تو بڑھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ بڑھ تو رہا ہے لیکن دکھائی نہیں دیتا۔ درخت لگایا ہے تو وہ بھی بڑھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ باباجیؒ بھی کہتے تھے کہ روحانیت میں کوئی ایسی تختی ہے نہیں، جو آپ سے لکھوائی جائے۔ جب پہلے آئے تھے تو کیسی بدصورتی تھی، اب دیکھو!!! باباجیؒ نے لکھا ہے کہ اپنے اخلاق دیکھیں۔ اخلاق میں ہماری کہاں تک ترقی ہوئی ہے؟ ہم کتنا بہتر ہوئے ہیں؟ Intent نیکیوں کی طرف زیادہ ہو گیا ہے یا نہیں؟ پہلے جبراً کرتے تھے، اب ذوق آیا ہے کہ نہیں؟ یہ پیدا ہوا ہے کہ اس کے بغیر چین نہیں آتا، تو یہ اس کی روحانی ترقی کے نشان ہوتے ہیں۔ اصل چیز اخلاق ہے۔

اخلاق میں بہتری ہو۔یہ دیکھنا دکھانا بھی ایسے ہی ہے۔قرآن میں آتا ہے کہ اگران کو آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں، یہ چڑھ بھی جائیں، دیکھ بھی آئیں، تب بھی یہ کہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو سحر کر دیا گیا ہے۔پھر بھی یہ مکر جائیں گے کہ جادو کر دیا گیا ہے۔ہمیں دکھائی تو دیا ہے لیکن اس میں کوئی فریب ہی تھا۔

جس کو Understanding ہے اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہوگی۔اس کو آپ سمجھ گئے اور Understand کر لیا۔عرفان جسے کہتے ہیں، اس کا Base زیادہ اچھا ہوتا ہے۔یہ جنت، دوزخ یہ سب کچھ کو تو دکھائی دیتا ہے اور کچھ کو اس کی Understanding پیدا ہوتی ہے۔یہ جو ساری مشینیں پڑھتے ہیں اس میں دکھائی تو کچھ نہیں دیتا کہ کدھر سے کرنٹ جاتا ہے، وہاں سے کرنٹ جاتا ہے۔سامنے تاریں پڑی ہوئی ہیں، Dead wires۔ان میں سے نہ کرنٹ جاتی دکھائی دیتی ہے، نہ آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔لیکن Theoretically وہ سب سمجھتے ہیں،ذہن میں ان کے آجا تا ہے۔اس لئے یہاں بھی کہا گیا ہے کہ آخری Parameter جو ہے وہ اخلاق ہے۔جس کا اخلاق اچھا ہے، وہی اچھا ہے۔حضورﷺ کی حدیث بھی ہے کہ سب سے بھاری چیز جو مومن کے نامہ اعمال میں ہوگی وہ اس کا اخلاق ہوگا۔

اب اس میں اخلاق جو ہے وہ دیکھا جائے۔دل کا رحجان ہو، ذوق پیدا ہو جائے، اس کے بغیر نماز پڑھے تو اس کو محسوس ہو کہ میں نے نہیں پڑھی۔Miss کر گیا۔اس کے بغیر نماز پڑھنے سے بوجھل ہو جائے۔برائی اس طرح سے ہو کہ اس سے کراہت پیدا ہو جائے جیسے کیچڑ میں چھلانگ لگانا اسے برا محسوس ہوتا ہے، طبیعت میں کراہت آئے۔اس طرح برائیوں میں ڈوبنا بھی اسے کراہت والا محسوس ہو۔یہ اصل ایمان کی نشانی ہوتی ہے۔یہ پیدا ہو جائے۔اللہ کی رحمت میں جب آدمی داخل ہوتا ہے تو اسے سب چیزوں کا Trend جو ہے یہ اندر سے بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کا رحجان نیکی کی طرف ہو جاتا ہے۔اچھے اچھے کام کرنے کے جذبات اٹھتے ہیں ولولے پیدا ہوتے ہیں۔دنیا میں یہ اور وہ سب کر دے۔وہ ترقی جو ہے یہ مرشد کے فیض سے

سب پیدا ہو جاتی ہے۔ میں یہ کرتا ہوں، میں وہ کرتا ہوں، کرے یا نہ کرے، اللہ موقع دے، تو کر بھی سکتا ہے۔ اپنے Field میں کچھ نہ کچھ وہ Improvement کے کام کرتا ہے۔ اس لئے باباجیؒ نے کہا کہ جس کا یہ نہ ہو وہ کرے۔ ایسے لوگ آخر میں جن کا Flash چلتا ہو، اکٹھا ان کو دکھا دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں، جن کو راستے میں دکھائی دیتا ہے زیادہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان خوبصورت Scenaries میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مرید اس واسطے نہیں ہوا جاتا۔

باباجیؒ (حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحبؒ) نے تو مولانا کریم الدین احمدؒ سے کہہ دیا تھا کہ میں یہ روشنیاں دیکھنے کے لئے بیعت تھوڑا ہوا ہوں۔ ایک آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ لے لو تو وہاں روشنیاں اس سے اچھی نظر آتی ہیں۔ ذکر اس لئے کرایا جاتا ہے کہ وہ بتیاں اور روشنیاں نظر آئیں؟ میں تو اس لئے بیعت نہیں ہوا ہوں۔ وہ اللہ میاں کدھر ہے؟ وہ روشنیوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ روشنی نظر آئی یا کسی کو دم کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا، کوئی بات نظر آ گئی، کشف ہو گیا کہ کل یہ ہونے والا ہے۔ یہ آج کل ویسے بھی ہو جاتی ہیں۔ باباجیؒ نے ان سے کہا کہ میں تو اس لئے بیعت نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو بس اللہ چاہئے۔

ایک بھائی نے پوچھا کہ باباجی! یہ جو نماز میں سوچیں آ جاتی ہیں اس کے لئے کوئی وظیفہ ہے؟ باباجانؒ (قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب توحیدیؒ) فرمانے لگے کہ ہاں جی! وظیفہ ہے۔ یہ ان کو پتا ہے مولوی محمد یعقوب صاحب کو (قہقہے)۔ وہ بتا دیں گے آپ کو۔ فرمایا کہ ان کو تنہائی میں بتانا، اکیلے میں۔ فرمایا: خربوزہ پکا ہے ہمارے پاس لیکن کوئی لینے نہیں آئے گا۔ ہمارے بھائی باباجی نیاز صاحب نے دوبارہ کہا کہ میں نے خان صاحبؒ (عبدالستار خان صاحبؒ) سے یہ سوال پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ بس جب بھی ایسا کوئی خیال آئے تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاؤ، اس کو راستہ دے دو، وہ بھاگ جائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کو پہچان جاؤ گے۔ پھر جب بھی آئے گا تو آپ کو پہچان ہو گی کہ آیا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ختم ہو جائے گا۔ آیا ہی نہیں کریگا

میں نے یہ آزمایا کہ ٹھیک ہے یہ بات۔

باباجانؒ (جناب محمد صدیق ڈار صاحب توحیدیؒ) فرمانے لگے کہ یہ بھی اچھا ہے۔

باباجانؒ سے کہا گیا کہ یہ جو آپ نے کیفیات بتائیں کہ نیکیوں کی طرف رجحان، برائیوں سے بچنے کی باتیں اور اخلاق کے حوالے سے۔ اگر جذب کو بالکل بے قابو کرنے کی بجائے اسے اگر بڑھا کر رکھا جائے تو پھر ہم بہت اچھے ہیں۔ اگر جذب کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے پھر تو ہم بہت ہی برے ہیں۔

باباجانؒ فرمانے لگے کہ نہیں نہیں !!! وہ تو ضروری ہے۔ وہ تو ہماری Inside کو ٹریننگ دیتی ہے۔ وہ تو یہ ہے۔ جب تک وہ نہیں ہوگی، کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ساتھ ساتھ یہ جو Feed ہے، یہ فیض لینا اور دینا یہ سارا جو ہے یہ Interlink ہے۔ سب Connected ہے باباجیؒ (حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحبؒ) نے تو فرمایا کہ جذب جو ہے یہ نبی پاک ﷺ کی امانت ہے۔ یہ آگے سینہ بہ سینہ بزرگوں میں چلتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے، پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ نہ ہو تو کوئی بندہ چاہ ہی نہیں سکتا۔ آگے جب وہ پیار والے پیار ڈالتے ہی نہیں ہیں تو وہ کیسے پیار کی بات چلے گی؟ کوئی نہ ملاقات ہوئی، نہ شکل وصورت دیکھی، نہ کچھ اور تو کیسے یہ فیض، توجہ چلے گی؟ تو یہ اس کے بغیر نہیں ہوتا۔ وہ تو ساتھ چلتا ہے۔ وہ Inside تو ہمارے وہی بات ہے جذب قلندرانہ۔ وہ ہونا چاہئے۔ اندر دلوں کو کشش کرتا ہے، Connect کر دیتا ہے اور وہ اندر محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اُس کے لئے سوتا ہے، جاگتا ہے، لمبے لمبے سجدے اور رکوع کرتا ہے۔ یہ جب تک نہ ہو تب تک نہیں ہوتا۔ یہی تو چیز ہے جو غائب ہو گئی ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

ملائے کم ظرف نے ملت میں پھوٹ ڈالی
تسبیح مصطفیٰ ﷺ ہے صدیوں سے دانہ دانہ

بکھر کے رہ گئے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ ہو گئے ہیں۔ ان کو اکٹھا کرنے والی کوئی چیز رہی نہیں ہے۔

اقبال مدرسوں نے بصیرت تو عام کردی
کمیاب ہوگیا ہے جذب قلندرانہ

وہ جو باہمی محبت تھی، انسان کی آپس میں محبت، پیر بھائیوں کی، مسلمانوں کی۔ وہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: رُحَمَـاءُ بَيْنَهُمْ ۔ (سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۲۹) آپس میں کشش کرنے والے، پیار کرنے والے، وہ نہ رہی۔ علامہؒ اس کو جذب کہتے ہیں۔ جذب کا مطلب کشش ہونا ہے کھینچنا۔ جذب قلندرانہ کہتا ہے کہ وہ غائب ہوگیا۔ اس کی ضرورت ہے۔

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تجھ سے جذب قلندرانہ

پڑھنے پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مولانا رومؒ بڑے پڑھے لکھے تھے۔ وہ بابا جی شاہ شمس تبریزؒ جو تھے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ انہوں نے عشق میں، محبت میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ انہوں نے پریم پریت کیا تو اُنہیں پتا چل گیا کہ یہ تو اور ہی بات ہے۔ سب پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیا، ان کے ساتھ لگ گئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

مولانا رومؒ جب اونٹوں پر سوار جاتے تھے تو کتابیں لدی ہوتی تھیں، وہ ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ طالب علم ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اتنے بڑے عالم تھے اور ان کے سٹوڈنٹس میں حصول علم کا وہ جوش اور رولولہ ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ لوگ چلتے تھے۔ جب وہ (شمس تبریزؒ) ملے تو لائن بدل دی۔ پیار والی لائن کا پتا چلا کہ یہ کیا ہے؟ احساس پیدا ہوتا ہے ناں کہ ہم تو بہت پیچھے رہ گئے۔ اس میں آئے پھر ٹھیک ہوئے۔ علامہؒ کہتا ہے کہ

صد کتاب و صد ورق در نار کن
روئے دل را جانب دلدار کن

ہزاروں صفحے ، کتابیں آگ میں ڈال دو۔ دل کا رخ اللہ کی طرف پھیر لے۔ چھوڑ دے کتابوں کو، دل کا رخ جو ہے بس یہ اللہ کی طرف ہو جائے۔ باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ مرشد یہی کرتا ہے۔ اس کو Tie کرتا ہے۔ تعلق جو ہے خدا کے ساتھ اس کا جوڑ ملا دیتا ہے۔ آگے پھر چلنا اس نے اپنی ہمت کے تحت ہے۔

باباجانؒ (جناب محمد صدیق ڈار صاحب توحیدیؒ) سے کہا گیا کہ وہاں رہ جاتے ہیں۔ فرمانے لگے: ہاں! آگے وہ طلب کی بات ہے ناں۔ جن میں طلب زیادہ ہوتی ہے وہ پہلے دن ہی سمجھو با مقصد شروع ہو جاتا ہے۔ جب وہ تعلق لگتا ہے، اسی دن ہی وہ Explode ہو جاتا ہے۔ Matter وہ خالص قسم کا اس میں سمایا ہوتا ہے۔ وہ ایک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے باقی کچی لکڑیاں لے کر کہ باباجی آگ لگا دی۔ وہ لگا دے گا۔ وہ سوکھتی رہیں گی، ساتھ ہی دھواں ماریں گی اور آہستہ آہستہ دھواں دیتی رہیں گی۔ تو وہ ایسے چلتے رہتے ہیں۔ جن کا وہ Heart ہوتا ہے First class وہ ُیک زمانہ صحبت با اولیاءان کا ہوتا ہے۔ ساری عمر تیاری کی، تقویٰ کی زندگی بسر کی، تہجد پڑھتے رہے، اور وہ ساری رات جاگتے رہے۔ وہ سب شرع کے مطابق عمل کرتے رہے، بس وہ پریم والی لائن کسی نے نہیں بتائی، پیار والی۔ یہ لوگ پہلے سے ہی تیار ہوتے ہیں۔

آج کل جو گاڑیوں میں پٹرول ڈالتے ہیں تو گاڑی بند کر دیتے ہیں۔ سگریٹ نہیں پیتے، موبائیل بھی آن نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی آگ لگ سکتی ہے۔ جیسے پٹرول کو دور سے آگ لگ جاتی ہے، ایسے ہی یہ بندے بھی تیار ہوتے ہیں۔ یہ Purity ان کی اور آگے ان کی جو طلب ہے، ہر بندے کی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ وہاں بزرگوں کی کہانیاں پڑھو۔ ان کے کام سنبھالنے والے ایک دو مرید ہی ہوتے ہیں۔ ویسے مرید خواہ ہزاروں ہوں لیکن ان کے مشن کو آگے چلانے کے لئے ایک دو بندے پیچھے ہوتے ہیں، جو چلاتے ہیں۔ انہوں نے ان کے مشن کو سمجھا اور آگے چلایا آگے پھر اللہ میاں اور کوئی بندے دے دیتا ہے، چلتا رہتا ہے۔ باباجیؒ (حضرت خواجہ عبدالحکیم صاحبؒ) کہتے ہیں کہ میں بہت خوش قسمت ہوں میرے پاس بہت زیادہ بندے ہیں،

بہت اچھے بندے ہیں۔کوئی بات نہیں،وہ چلتا رہتا ہے۔تھوڑا بہت چلو اُوپر نیچے بھی ہوتا رہتا ہے Man to man بھی فرق پڑے گا۔لیکن یہ ہے کہ جس کا تعلق شیخ کے ساتھ صحیح رہتا ہے ان کو صحیح فیض ملتا ہے اور آگے چلتا رہتا ہے۔جذب جو ہے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔فیض اسی سے آگے بڑھتا ہے۔

باباجانؒ (قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب توحیدیؒ) سے راقم نے پوچھا کہ باباجان طلب کو بڑھانے کے لئے کیا کرتے ہیں؟

فرمانے لگے:نہیں یہ Inherit ہوتی ہے۔ادھر ہی ہوتا ہے یہ پیار۔وہ جیسے فرمایا کہ

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

مختصری سوچ ہے کہ سب سے زیادہ حسین تو اس کائنات میں، میں خود ہوں۔ہیرا جو ہے وہ میں ہی ہوں۔اس نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا کہ میں کیا ہوں؟ آپ کو پتا ہونا چاہئے کہ میں کیا ہوں؟ کس لئے آیا ہوں؟ سب سے بہترین تو میں ہی ہوں۔یہ جو اردگرد کی دنیا ہے میں اس کی غلامی کیوں اختیار کروں؟

او حریم و در طواف اش کائنات

''وہ خود جو ہے وہ حرم ہے اور کائنات اس کے گرد طواف کر رہی ہے''۔

اللہ کہتا ہے کہ میرے سوا جو کچھ پیدا ہوا ہے یہ سب تمہارے لئے ہے۔ان کا مرکز یا سینٹر جو ہے وہ انسان ہے۔'او حریم و در طواف اش کائنات'۔وہ حریم ہے اور حرم ہے،اور کائنات اس کے گرد طواف کرتی ہے۔تو وہ اپنا مقام یاد رکھے کہ مجھے اللہ نے اپنے لئے بنایا ہے اور اس سب مخلوق کو میرے لئے بنایا ہے۔وہ طلب جو ہے یہ Inherit ہوتی ہے۔باباجیؒ نے لکھا ہے کہ نہ کھانے میں مزا آئے، نہ جاگنے میں، نہ سونے میں، نہ بھوک لگے، نہ پیاس لگے،ایسے کوئی بندہ ملے جو ملائے۔یہ کس میں تھا؟ باباجیؒ تو آٹھ دس سال ڈھونڈتے رہے۔کیا کچھ کیا۔ہم تو ایسے ہی

باباجیؒ کے پاس چلے گئے۔انہوں نے قابو کرلیا۔یہ ان کی مہربانی ہے۔یہ عنایت ہے کہ آپؒ (حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحبؒ) نے ہمیں سینے سے لگالیا بس۔

مرکز سے ہدایات

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی درج ذیل آفاقی و عالمگیر، اخلاقیات اور دین کی صحیح تعلیمات پر مشتمل کتب میں اصلاحی مضامین جو بندوں کے اپنے ربّ کے تعلق کو تازہ، معارف و حقائق کے بہتے دریا، مسافران راہ سلوک کے لئے زادِراہ، حکمت و موعظتِ حسنہ کا شعور اُجاگر کرتے ہیں۔ان کتب کی افادیت و نافعیت کو دوام اور بقاء حاصل ہے، جن میں قابل اصلاح پہلوؤں کی نشاندہی بھی ہے اور نشان منزل کا تعین بھی۔یہ کتب فکر و عمل کی اصلاح کیلئے بہترین راہنما ثابت ہوتی ہیں۔لہٰذا ان کو شیڈول کے مطابق پڑھیے اور اپنے ایمان کو جلا بخشئے:

مہینہ	کُتب
دسمبر 2020ء	تعمیر ملت
جنوری 2021ء	طریقت توحیدیہ اور حقیقت وحدت الوجود
فروری 2021ء	چراغ راہ
مارچ 2021ء	مقصود حیات

اسلام میں اعتدال پسندی

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

اسلام دین فطرت ہے ۔اس کے اصول،قواعد اور ضوابط انسانی فطرت اور انسان کے طبعی تقاضوں کے عین مطابق ہیں ۔یہ بنیادی طور پر اہم بات ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے ۔وہی تمام ہدایات اور احکام کا سرچشمہ ہے ۔انسانی فطرت کا صحیح علم صرف اسی کو حاصل ہے کیونکہ اس نے انسان کو اور اس کے فطری تقاضوں کو پیدا کیا ہے ۔ ہزار ہا سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد بھی انسان نے اپنی فطرت کے بارے میں جو علم حاصل کیا، اس علم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے ہرگز کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر انسان اپنی فطرت اپنی ضروریات اور اپنے بارے میں خوب اور نا خوب کو صحیح طور پر نہیں سمجھتا ۔انسان کی فطرت اس کے طبعی تقاضوں اور اس کی اچھائی اور برائی کو اگر کوئی ہستی صحیح طور پر سمجھتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ دوسرے درجے پر انسان کی فطرت کا علم انبیاء کو حاصل ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم ہے ۔

انسان نے اپنے بارے میں جو کچھ سوچا، اپنے بارے میں جہاں جہاں نظام ہائے زندگی مرتب کیے اُن کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے ناقص علم پر مبنی ہیں ۔انسانی فکر، انسانی فطرت کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک طور پر سمجھے بغیر انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجہ بار بار ٹھوکریں کھاتا ہے ۔انسانی فکر کی دوسری بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ صرف اپنے دور کے بارے میں سوچ سکتا ہے ۔انسانی فکر، وقتی اور ہنگامی تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے ۔

انسانی فکر کی تیسری بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ بغاوت اور ردِ عمل پر مبنی (Reactionary) ہوتا ہے ۔انسانی تحریکوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے، معلوم ہوگا کہ انسان

ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی بجائے جذباتی انداز میں سوچنے کا عادی ہے۔اس کی سوچ کا نوے فیصد حصہ غصے اور نفرت پر مبنی ہوتا ہے۔انسانی فکر نے کبھی تحریک کی شکل اختیار نہیں کی۔جب تک اس نے انسانوں کے ایک گروہ کو جذباتی انداز میں اپنے ساتھ نہ ملالیا ہو۔

انسانی فکر کی ان تین بنیادی خامیوں کو مدنظر رکھیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ انسان کے بنائے ہوئے نظام ہائے زندگی، انسان کے بنائے ہوئے قواعد وقوانین ہمیشہ اس کی صحیح فطرت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔انسانی قوانین کبھی اس انتہاء کی طرف اور کبھی اس انتہا کی طرف مائل ہوتے ہیں۔کبھی افراط اور کبھی تفریط، پنڈولیم کی سوئی کی طرح ایک انتہاء کی جانب حرکت ہی حرکت، اور کبھی بھی درمیان میں رکنے کا نام نہیں۔انسانی فکر کو کبھی درمیان کا راستہ اور اعتدال کی منزل نصیب نہیں ہوئی۔اسلام چونکہ عین فطرت کے مطابق ہے اس لیے انسانی فکر کی انتہاپسندیوں کے عین درمیان چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔زندگی کا کوئی پہلو ہو، سیاسی، سماجی یا معاشی اور زندگی کا کوئی مرحلہ ہو، ہر قدم پر اسلام آپ کو بے شمار انتہاپسندیوں کے عین درمیان میں اعتدال کی راہ اختیار کیے ہوئے نظر آئے گا۔چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

معاشی زندگی میں انسان نے سرمایہ دارانہ ذہنیت سے سوچا اور لامحدود ملکیت کا نظریہ پیش کیا اور ہزارہا سال تک لامحدود ملکیت کے دیوتے غریب انسان کا خون چوسا اور معاشی استحصال کا سلسلہ جاری رہا۔سرمایہ دار کی لامحدود ملکیت سے پیدا کردہ انسانیت کا معاشی استحصال کا سلسلہ جاری رہا۔جب انسانیت سرمایہ دار کی لامحدود ملکیت سے پیدا کردہ معاشی استحصال سے بلبلا اٹھی تو اس نے لامحدود ملکیت کی انتہاپسندانہ مخالفت کرتے ہوئے نظریہ ملکیت تک کو ٹھکرا دیا یعنی ایک انتہاء سے دوسری انتہاء کی طرف اور نتائج وہی کے وہی! اب دیکھیے! ان دونوں انتہا پسندانہ نظریوں کے عین درمیان میں اسلام کا نظریہ ملکیت نظر آئے گا جس میں دونوں انتہاؤں کی خامیاں محدود نہیں ہیں۔ایسے ہی سیاسی زندگی میں بھی انسان ہزارہا سال تک شخصی حکومت کا صور پھونکتا رہا۔حد یہ ہے کہ ارسطو جیسا مفکر بھی جمہوریت کو بدترین طرزِ حکومت قرار دیتا رہا۔بعد میں

انسانی فکر نے باغیانہ انگڑائی لی تو ہر طرف جمہوریت اور ایسی جمہوریت کے گن گائے جانے لگے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے' اور ایسی جمہوریت جس میں کثرت رائے سے انسانیت کا قبیح ترین جرم بھی جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ان دونوں انتہاؤں کے عین درمیان آپ کو اسلام کا سیاسی نظام نیم جمہوری اور نیم شخصی طرز کا نظر آتا ہے۔جس میں قانون سازی اور اقتدارِ اعلیٰ نہ کسی ایک انسان کو حاصل ہے اور نہ انسانوں کی کسی ان پڑھ جماعت کو بلکہ یہ قانون سازی اور اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور خلافت کی نمائندگی کا حق انسانوں کی ایک تعلیم یافتہ، متقی جماعت کو جسے شوریٰ کہتے ہیں حاصل ہوتا ہے۔تو اصل بات یہ ہے کہ اسلام کا راستہ ہی اعتدال کا راستہ ہے یہی مطلب ہے حضورﷺ کے اس ارشاد کا کہ "بہترین کام وہی ہے جو اعتدال پر ہو۔"

انسان نے روح اور جسم کے تقاضوں کے بارے میں جب بھی کوئی لائحہ عمل اختیار کیا اس میں عجیب انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا۔سالہا سال تک لوگ رہبانیت اختیار کر کے جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں تپسیا کرتے' تب انہیں گیان دھیان نصیب ہوتا ،لیکن جن لوگوں کو گیان دھیان نصیب ہوتا' وہ خاندانی زندگی' اولاد، ہمسائیگی اور انسان کی دیگر اہم ضرورتوں سے یکسر محروم رہتے۔دوسری انتہا یہ کہ جو لوگ دنیا دار ہوتے اور اپنے آپ کو کسی روحانی ترقی کے قابل نہ سمجھتے۔ان کا کام فقط یہ ہو سکتا تھا کہ وہ روحانی پیشواؤں کے آگے ہاتھ پھیلا دیں اور ان کی خدمت کر کے نجات حاصل کریں۔بالفاظ دیگر انسانی نظاموں میں جو شخص دنیا داری کے لائق ہے وہ روحانیت کے لائق نہیں اور جو روحانی پیشوا بن سکتا ہے۔وہ بھری اور آباد دنیا کے اندر رہنے کے لائق نہیں۔آپ دیکھیں کہ اسلام کا راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان بالکل اعتدال کا راستہ ہے۔اسلام نے روزہ فرض قرار دے دیا۔لیجئے روحانیت کا بہت بڑا حصہ حاصل کرنا ہر شخص کے لیے ضروری قرار پایا۔ایک ماہ تک ایسی مشق کرائی جاتی ہے کہ عیش و آرام کی بہترین صورتیں یعنی کھانا، پینا، سونا اور جنسی لذت حاصل کرنا، تینوں میں شدید کمی پیدا کر دی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر شخص کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ والدین اہل و عیال ہمسایوں اور دیگر تمام لوگوں کے

حقوق اسی بھری دنیا کے اندر ادا کرے۔یعنی دنیا داری اور روحانیت دونوں میں انتہائی حسین اعتدال کی صورت پیدا فرمادی۔

حضورﷺ نے ارشاد فرمایا ’’کہ اسلام میں ترک دنیا جائز نہیں ہے اگر کوئی شخص مخلوقات سے کچھ دیر کے لیے منقطع ہوکر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو وہ مسجد میں چلا آئے۔اعتکاف اس کی بہترین صورت ہے۔مزید بر آں مسجد میں پانچ وقت کی نماز اور رات کا قیام بھی اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔

تو اصل بات یہ ہے کہ اسلام کا راستہ ہی اعتدال کا راستہ ہے۔یہی مطلب ہے حضورﷺ کے اس ارشاد کا کہ ’’یعنی بہترین کام وہی ہے جو اعتدال پر ہو۔‘‘

فرامین خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

عمل: اپنی اور اپنے متعلقین کے بقائے حیات کے لئے خود کام کرو۔اپنا بوجھ کسی دوسرے پر ہرگز نہ ڈالو،یہ سب سے بڑی بے حیائی ہے۔جو کام شرعاً جائز ہو اسے ہرگز ذلیل اور برا نہ سمجھو،ملک اور قوم کی بہبود کے لئے کام کرنا عبادت ہے۔یقین جانو کہ ہر قسم کا رنج اور فکر صرف کام کرنے ہی سے دور رہتا ہے اور صحبت،عزت، دولت اور راحت صرف کام کرنے ہی سے ملتی ہے۔جب شش جہت میں مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہوں،چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہو اور خود کشی کرنے کو دل چاہتا ہو،اس وقت کام میں مصروف ہو جاؤ اور کام کرتے رہو، کرتے رہو،یہاں تک کہ صبح مسرت کا آفتاب عالم تاب اپنی نور پاشیوں سے تمہارے دامن مراد کو مالا مال کردے۔ (اقتباس از تعمیر ملت)

فوجی جوان

(حکیم محمد سعیدؒ)

دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ اپنے جوانانِ سپاہ کو جس طرح محبت وعزت، قدر ومنزلت، احترام واحسان مندی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عوام کے ان احسانات کی وجہ بھی ڈھکی چھپی نہیں ہوتی۔ ملکی سرحدوں کے استحکام، آزادی کے تحفظ اور تہذیب وتمدن کی بقاء کی پاسبانی اور ان کے لیے جاں نثاری کی اہم و نازک ذمہ داری جن جوانوں کے کاندھوں پر ہوتی ہے، ان کے لیے سراپا محبت بن جانا بالکل قدرتی امر ہے۔ پاکستان کے فوجی جوان سے ہماری محبت کا عنوان صرف یہی نہیں، بلکہ اس کے محرکات کہیں زیادہ گہرے اور وسیع ہیں۔

بے جا نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ اس سے ہماری محبت اس لیے بھی ہے کہ وہ ایک آفاقیت کا مظہر اور ابدیت کا نشان ہے۔

اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے آئے ہوئے آسمانی صحیفہ ہدایت میں انسان کے صرف ایک گروہ کے بارے میں یہ دلچسپ انکشاف پایا جاتا ہے کہ وہ مرتا نہیں، بلکہ وہ شہادت کے دوسری طرف اسے فوراً ابدی نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ پھر اسی گروہ سے متعلق سورۂ آلِ عمران (آیات ۱۴۶-۱۴۸) میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ وہ انبیا علیہم السلام کی معیت میں عزم وثبات کے ساتھ باطل کے خلاف سر بہ کف رہا ہے اور دُعا کا یہ رجز اس کی زبان پر جاری رہا ہے کہ ربِّ قدیر اس پر نگاہِ عفو وکرم رکھے اور اس کی استقامت کو لغزشوں سے محفوظ فرمائے۔ اس موقع پر تکرار کے ساتھ یہ خوش خبری دی گئی ہے:

اللہ یحب الصبرین اور **واللہ یحب المحسنین**۔

مجاہدیت کا فرضِ منصبی جتنا عظیم، ایثار طلب اور حیاتِ انسانی میں منفرد ترین ہے اتنی ہی اس کی صفات اعلیٰ اور بے نظیر ہیں جن کا پیکر ہونے کی بہ دولت اسے خالقِ کائنات نے اپنی محبت

کی سند عطاء کی ہے۔اسلام کا جیالا سپاہی جب اسے اتنا محبوب ہے تو ہمیں کیوں نہ ہو۔وہ اس طرزِ زندگی کا ضامن بن کر کھڑا ہوتا ہے کہ جو اس کرۂ ارض پر فلاح و ترقی، امن و سلامتی، انسان دوستی اور کمال آفرینی کا مثالی مرقع ہے۔

اس کی روح جس اخلاق عالیہ سے سرشار اور اس کے دل و دماغ جس نورِ ہدایت سے منور ہیں اس سے وہ پوری انسانی تاریخ عسکریت میں الگ اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔اس مقام کی صحیح قدر شناسی کا کوئی امکان اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک آپ کو یہ اندازہ نہ ہو کہ اس اخلاق کی پرچھائیاں تک کہیں اور نہیں ملیں۔جنگ سے متعلق انسانی فکر و عمل پر جو قیامت کی تاریکی طاری ہو رہی ہے وہ اسلام کے علاوہ پوری تاریخ کا المناک حصہ ہے۔مغرب نے گروٹیوس کو جدید بین الاقوامی قانون کا بابا آدم تسلیم کیا ہے اور وہ ایک اخلاق پرور مقنن مانا جاتا ہے ذرا اس کی رائے سنیے:

"قانون میں ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا جائز ہے
جو دشمن کی حدود میں پائے جائیں۔اس میں عورتوں اور بچوں
کو کوئی استثنا نہیں ہے اور وہ اجنبی باشندے بھی مستثنا نہیں ہیں
اور جو ایک معقول مدت کے اندر دشمن کے علاقے کو نہ چھوڑ دیں"

سترھویں صدی تک یورپ محارب اور مقاتل کے فرق سے ناآشنا تھا۔پھر اسیرانِ جنگ کے لیے قتل اور وحشیانہ بدسلوکی مقدر تھی۔بیسویں صدی میں آکر ہیگ اور جنیوا کنونشنوں کے ذریعے سے اس صورت حال میں قانوناً تو خاصی اصلاح ہوئی، لیکن اس پر عمل کم ہی ہوا۔

اسلام کے تصورِ جنگ نے انسانیت کو جتنا بلند کیا ہے وہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ایک وہ تاریک دھارا ہے جو ہوس گیری سے جنم لیتا اور استعمار کی بربریت پر ختم ہوتا ہے اور ایک یہ روشنی کی شاہراہ ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کی ہے۔اس کی تحریک، اس کا ارادہ اور اس کا عمل ازاوّل تا آخر سراپا عبادت ہے۔یہاں قتال بے قید نہیں۔یہاں وحشیانہ انتقام نہیں، یہاں بے لگام مفاد پرستی نہیں۔

یہاں جارحانہ قوم پرستی نہیں ۔ یہاں عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور، یہاں تک کہ سب غیر مقاتل لوگ محفوظ و مامون ہیں ۔

یہ ہے نظریہ اور یہ ہیں روایات جن کا امین ہونے کی سعادت ہمارے فوجی جوان کو حاصل ہے اور اس کا یہی رول اسے ہماری محبت کا مرکز بناتا ہے ۔ وہ جس تاریخی تسلسل کا نشان اور مستقبل کا نقیب ہے، اُسے اقبال نے پرسوز خراج عقیدت یوں پیش کیا ہے ۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

جوانی اور صحت مند زندگی

(محمد انور بن اختر)

(گزشتہ سے پیوستہ)

انسانی عمر کو گھٹانے والے اسباب

۱۔ ضرورت سے زیادہ خوراک کھانا یا ضرورت سے بہت کم کھانا۔

۲۔ زیادہ مرغن اور ثقیل چیزیں کھانا، بالکل ناکارہ چیزیں کھانا۔

۳۔ زیادہ گرم یا زیادہ ٹھنڈی چیزیں کھانا۔

۴۔ بہت جلد غذا کھانا۔

۵۔ زیادہ گوشت خوری کرنا۔

۶۔ گرم مصالحہ، مرچ تلی بھنی ہوئی زیادہ چیزیں کھانا۔

۷۔ زیادہ میدہ، نشاستہ، سفید چینی اور برف کا استعمال۔

۸۔ مکھن، دودھ، لسی کم کھانا۔

۹۔ زیادہ بازاری چیزیں کھانا۔

۱۰۔ شراب، افیون، بھنگ، چرس، تمباکو، چائے اور قہوہ کا استعمال۔

۱۱۔ ضرورت سے زیادہ جسمانی اور دماغی محنت اور جسم اور دماغ کو زیادہ تکلیف دینا اور آرام نہ کرنا۔

۱۲۔ کاہل رہ کر جسم کو موٹا کرنا۔

۱۳۔ کوئی مضر صحت پیشہ اختیار کرنا۔

۱۴۔ ضرورت سے زیادہ ورزش کرنا یا بالکل نہ کرنا۔

۱۵۔ بہت زیادہ یا بہت کم نیند لینا۔

۱۶۔ بالکل بند کمرہ میں سونا۔

۱۷۔ ناک کے ذریعے سانس نہ لے کر منہ کے ذریعے سانس لینا۔

۱۸۔ گندے ماحول اور خراب آب و ہوا میں رہنا۔

۱۹۔ کپڑے اور جسم کی صفائی نہ رکھنا۔

۲۰۔ بیٹھتے، اُٹھتے یا کھڑا ہوتے ہوئے کمر کو جھکا لینا۔

۲۱۔ بدہضمی اور قبض رہنے پر اس کا خیال نہ کرنا اور پانی کم پینا۔

۲۲۔ اشتہاری اور نیم حکیموں کی دوا استعمال کرنا۔

۲۳۔ ہنسی خوشی اور کھیل کود کے مشاغل میں حصہ نہ لے کر ضرورت سے زیادہ مہذب اور سنجیدہ ہونا۔

۲۴۔ دنیا اور اس کے کاموں میں دلچسپی نہ لینا اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرنا۔

۲۵۔ غم و غصہ اور رنج و فکر میں مبتلا رہنا۔

۲۶۔ ہر وقت خوف و ہراس میں رہنا۔

۲۷۔ مایوس، مضمحل اور نا اُمید رہنا زندگی کے تاریک پہلو دیکھنا۔

۲۸۔ مزاج میں چڑ چڑا پن اور بداخلاقی کا ہونا۔

۲۹۔ حسد، نفرت، غصہ، کینہ، تنگ دلی سے زندگی کا محض تاریک پہلو دیکھنا۔

۳۰۔ شک و شبہ میں پڑے رہنا اپنے آپ پر بھروسہ نہ کرنا اور مایوس رہنا۔

۳۱۔ قوت ارادی کا کمزور ہونا اور مستقل مزاجی سے کام نہ لینا۔

۳۲۔ ہر ایک کام دیر سے کرنا یا زیادہ جلدی کرنا۔

۳۳۔ کثرت مجامعت، عیاشی، زنا کاری، غلط کاری، چوری بدخیالی اور دیگر گناہوں کا شکار ہونا۔

۳۴۔ اپنی برائی سے آنکھ بند کر کے دوسروں کی غیبت کرنا۔

۳۵۔ احسان فراموش ہونا۔

۳۶۔ قانع نہ ہونا اور خودغرض بنے رہنا۔ دھوکہ فریب سے کام لینا۔

۳۷۔ دنیاوی چیزوں سے زیادہ لگاؤ رکھ کر مالکِ کل کو بھلا دینا۔

۳۸۔ بے ایمانی اور بددیانتی سے روزی کمانا۔

۳۹۔ پروردگارعالم کا خوف اور بھروسہ نہ کرنا۔

جولوگ اپنی عمر کم نہیں کرنا چاہتے اور دیر تک تندرست رہ کر جینا چاہتے ہیں۔ان کو مذکورہ بالا باتوں کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے۔جس حد تک وہ اس میں کامیاب ہوں گے اسی حد تک وہ تندرستی اور طویل العمری کے حقدار ہوں گے۔

جوانی کی بارہ سیڑھیاں:

یہ ایک انگریزی کتاب ہے جس کے مصنف ہیں مسٹر ولفورویلیل اور کتاب کا نام (Pro Long Your Youth) یعنی اپنا عرصہ لمبا کرو۔اس شخص نے زندگی کے مسائل کے ہر ایک پہلو پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس نے اپنی کتاب جو جوانی کی طوالت کے متعلق لکھی ہے، کے اختتام پر جو بارہ اصول لکھے ہیں میں ان کو جوانی کی بارہ سیڑھیوں کا نام دیتا ہوں۔ان بارہ اصولوں پر کاربند ہوکر انسان اپنی عمر میں اضافہ کرسکتا ہے۔وہ بارہ سیڑھیاں درج ذیل ہیں۔

ا۔زندگی کے فلسفے کو سمجھنا: انسان خیالات کا پتلا ہے۔انسان کے خیالات ہی انسان کو آسمان پر پہنچا سکتے ہیں اور یہ خیالات ہی تحت الثریٰ میں لے جا سکتے ہیں۔اس کے خیالات کی پاکیزگی اور پلیدی لازمی ہے جو آدمی جیسا سوچے گا ویسا بن جائے گا۔ہر حال میں خوش رہنا چاہئے۔یہی زندگی کا حقیقی فلسفہ ہے اس لیے مایوسی اور فکر کو پاس نہ آنے دے۔

۲۔ تنظیم:

اپنی ذات کی ،اپنے کاروبار، اپنے کھانے پینے کی ،سونے جاگنے کی ، اٹھنے بیٹھنے کی،کھیل کود کی غرض یہ کہ ہر ایک بات میں تنظیم سے کام لو۔جس طرح حدود کے اندر بہتا دریا بے شمار بندگان خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے اور حدود توڑ کر ہزاروں کی تباہی کرسکتا ہے۔اسی طرح تنظیم کی زندگی لطف وسرور کا سرچشمہ ہوتی ہے اور تنظیم سے باہر بے قاعدہ زندگی آفتوں اور مصیبتوں کی آماجگاہ بنتی ہے۔

۳۔ دلچسپ پیشہ یا کاروبار:

اگر انسان کا دھندہ روزگار ایسا ہو جس میں دل بھی لگا رہے اور روزی کا بھی سامان انسان کے لئے کافی مہیا کرے تو زندگی کو بڑھانے میں بہت مدد دیتا ہے۔ کام کاج ایسا ہونا چاہئے جس میں محنت بھی کرنی پڑے اور آرام بھی ملے ،پیسے بھی اچھے ہوں اور دل کوا کتانے والا بھی نہ ہو۔

۴۔ بدن کی اندرونی صفائی:

جسم کے اندر فاسد مادہ نہ رہنے دیا جائے ۔ضرورت پڑے تو ایک دو دن کے فاقہ سے یا ایذا کر کے یا بھاپ کا غسل کر کے فاسد مادہ خارج کر دینا چاہئے ۔

۵۔ زندگی بخش خوراک:

جو چیزیں جتنی زیادہ مرتبہ آگ پر چڑھائی جائیں گی اتنی ہی زیادہ مردہ خوراک بن جائیں گی ۔اس لئے زندہ خوراکوں میں تازہ پکے پھل ،خشک گری اور دوسرے میوے ،تازہ سبزیات ،مکھن ،کچا دودھ ،شہد ،پنیر تازہ انڈے شامل ہیں ۔سفید چینی نشاستہ اور گوشت منع ہے۔

٦۔ٹھیک سانس لینا:

تازہ کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ دیر تک رہنا اور ناک کے ذریعے پورا سانس لینا جس سے پھیپھڑوں کے ہر حصے میں تازہ ہوا بھر جائے اور غلیظ ہوا باہر نکل جائے دن میں کئی بار خاص طور پر سیدھے کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینا۔

٧۔زندگی بخش ورزش:

روزانہ باقاعدہ اس قسم کی ورزش کرنا جس سے تمام جسم کے اعضاء حرکت میں آئیں اور جسم میں لچک قائم رہے۔

ورزش نہ تو کسی ایک خاص عضو کی ہو اور نہ ہی تھکا دینے والی ہو۔پچاس برس کی عمر کے بعد کھلے میدانوں میں سیر کرنا بہترین ورزش اور صحت مند عادت ہے۔

٨۔زندگی بخش غسل:

ننگے جسم کو پانی سے صاف کرنا، ٹھنڈی ہوا پہنچانا، دھوپ اور روشنی پہنچانا، بارش، دریا، سمندر میں نہانا، ٹھنڈے پانی سے غسل کے مقابلہ ٹھنڈی ہوا کا غسل زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

٩۔مسکرات یعنی نشیلی چیزیں:

تمباکو نوشی، چائے، قہوہ سے پرہیز کرنا چاہئے۔تھوڑی مقدار میں زیادہ نقصان تو نہیں دیتے لیکن پرہیز زیادہ مفید ہے۔

١٠۔حواس خمسہ کی درستی:

آنکھ، کان، ناک، زبان اور دانت وغیرہ کی صفائی اور حفاظت رکھنی چاہیے کیونکہ ان میں سے کسی ایک بھی چیز کے کمزور ہونے سے زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

۱۱۔قوت باہ کا درست استعمال:

پاکیزہ خیالات اور نیک نیتی کے ساتھ قوت باہ کا جائزہ اور مناسب استعمال دماغی صلاحیت کو جلا دینے کا موجب ہے۔اس سے متمتع ہونا چاہئے۔تاہم اس کا ناجائز اور حد سے زیادہ استعمال زندگی کے درخت پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہے۔

۱۲۔آرام وسکون:

فرائض کی پوری ادائیگی کے بعد جسم اور دماغ کو آرام دینا اور گہری نیند لینا عمر کو بڑھانے کا خاص جزو ہے۔یہ ہیں جوانی کی سیڑھیاں۔یہ سیڑھیاں آپ کو جوانی کے محل کی چھت پر پہنچا کر زندگی کے دلکش نظاروں کو دیکھنے کا موقع دے سکتی ہیں۔

جوانی کے دشمن:

اس امر کے متعلق کافی وضاحت سے تحریر کیا جا چکا ہے کہ صحت اور زندگی کی جہاں خوراک سے کافی حد تک وابستگی ہے وہاں دل کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔دل اگر مریض اور کمزور ہو تو اچھی سے اچھی خوراک بھی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔اس لئے دل کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔دل کو کمزور کرنے والے اسباب کی جانب سے زیادہ سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔یہاں ان اسباب کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔فکر:

دل کو سب سے زیادہ کمزور کرنے والی بلا فکر ہے۔کئی طرح کا فکر انسان اپنے آپ کو لگا لیتا ہے۔بعض لوگ تو ماضی کے واقعات اور نقصانات کو بار بار یاد کر کے متفکر رہتے ہیں۔بعض مستقبل میں آنے والے مصائب کا خیال کر کے خوفزدہ رہتے ہیں۔انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ پیچھے جو ہو چکا وہ ہو چکا فکر کرنے سے اب کیا حاصل؟ گزرا ہوا زمانہ تو اب واپس نہیں آسکتا اور آنے

والے زمانے کا پتہ نہیں کہ اس میں کیا تبدیلی ہو جائے ۔جن مصائب سے ہم ڈر رہے ہیں وہ نازل ہوں بھی یا نہ ہوں ۔بعض لوگ اپنے جسم کے متعلق ہی فکر کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جسم دبلا پتلا کیوں ہے ۔یہ فلاں پہلوان جیسا کیوں نہیں بن جاتا بعض لوگ اپنی عزت و وقار کے متعلق ہی دکھی رہتے ہیں اور بعض دین اور مذاہب کے پیچیدہ سوالوں کے متعلق ہی پریشان رہتے ہیں ۔یہ تمام تفکرات بے بنیاد اور زندگی کے دشمن ہیں ۔

۲۔ مایوسی اور ناامیدی:

ان سے بھی دل پر بہت برا اثر پڑتا ہے اگر کوئی کام ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمارا مایوس ہو جانا اور ہمت ہار بیٹھنا کوئی جوانمردی نہیں ۔بجائے مایوس و ناامید ہونے کے ہمیں دگنے اشتیاق اور دگنی طاقت سے اسے سرانجام دینے کے لئے دوبارہ کوشش کرنی چاہئے ۔

۳۔غصہ:

خون کے اندر جتنا زہر غصہ سے پیدا ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو ۔خون نہ صرف زہریلا بنتا ہے ۔بلکہ بہت زیادہ غصہ کی حالت میں خون جل جاتا ہے ۔اس لیے غصہ سے ہر حالت میں بچنا چاہئے ۔

۴۔نفرت:

ایک آدمی کے خیالات ہم سے نہیں ملتے یا ایک آدمی کی عادات ،حرکات و اعمال ہمیں ناپسند ہوں یا ایک آدمی کسی دوسرے مذہب کا پیرو ہے اگر ان وجوہات کی بناء پر ہم اس سے نفرت کرتے ہیں تو اس سے اس کا کیا بگڑے گا۔ہم اپنے دل میں کانٹا کیوں کھڑا کر لیتے ہیں۔ جو ہمیں چین نہیں لینے دیتا ۔نفرت کرنے سے بھی دل کمزور ہو جاتا ہے ۔

۵۔حسد:

کسی کے جاہ و مرتبہ، زر و دولت، شان و شوکت گھر بار بیوی بچوں کا اپنی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے آپ کو کمتر سمجھ کر دوسروں سے حسد کرنے سے بھی دل کمزور پڑ جاتا ہے اس لیے یہ بدعات بھی ترک کر دینے کے لائق ہیں۔

۶۔چغلی:

دوسروں کی برائیاں کرتے رہنے سے اور ایک کی بات دوسرے کے سامنے کرنے سے بھی دل میں کمزوری آتی ہے۔

۷۔عیب جوئی:

دوسروں کے نقائص کی تلاش اور ٹوہ لگاتے رہنا اور دوسروں کی برائیوں پر نگاہ رکھنا بھی دل کو کمزور کرتا ہے۔

۷۔خودغرضی:

جو انسان ہمیشہ اپنی غرض کو ہی سامنے رکھتا ہے اور اپنے نفع کے لیے دوسروں کا نقصان کرنے سے نہیں ہچکچاتا، اس کا دل کبھی مضبوط نہیں رہ سکتا۔اس لئے وہ طویل العمر نہیں ہو سکتا۔

۹۔خیالات کی ناپاکی:

برے خیالات دل کو مریض بنانے والے ہیں بدترین جراثیم ہیں۔ناپاک خیالات کا مالک کبھی درازعمر نہیں پا سکتا۔

۱۰۔دھوکہ فریب:

دوسروں سے دھوکہ فریب کرنے والے آدمی کا دل ہمیشہ کانپتا رہتا ہے کہ کہیں اس کے پول نہ ظاہر ہو جائیں۔یہ خوف اسے سدا ستاتا رہتا ہے اور دل کمزور ہو جاتا ہے۔

۱۱۔نفس کی غلامی:

دل کا بیڑہ تباہ کرنے والی عادات میں نفس کی غلامی نمبر ایک پر ہے ۔نفس امارہ کا غلام ہمیشہ پریشان رہتا ہے وہ کئی طرح سے اپنے دل پر ضربیں لگا تا ہے ۔یعنی بھاگ دوڑ سے ،مال و دولت لٹانے سے ،اپنا مادّہ منویہ ضائع کرنے سے اپنی بدکرداری کے عیاں ہونے سے خوف سے بدنامی وغیرہ سے اس لیے طویل عمر کے خواہاں انسانوں کا نفس پر قابو رکھنا لازمی ہے۔

۱۲۔جلد بازی:

انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے۔ ہری (Hurry) وری (Worry) اور کری (Curry) یعنی جلد بازی ،فکر و تشویش اور پُرخوری یہ تینوں انسان کی صحت اور زندگی کے دشمن ہیں ۔ان تینوں میں جلد بازی کو آگے دکھایا گیا ہے جلد باز آدمی ایک تو جلد بازی کرتے وقت اپنے دل پر کافی بوجھ ڈالتا ہے پھر وہ جلدی میں بڑی خطرناک غلطیاں کر جاتا ہے جس کے باعث اسے ندامت ہوتی ہے ۔اس کے دل کو بہت صدمہ ہوتا ہے ۔جلد بازی سے بسا اوقات نقصان بھی ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے دل پر سخت چوٹ ہوتی ہے۔

۱۳۔فضول بحث و مباحثہ:

بعض لوگ سیاسیات مذہب یا دیگر قسم کے مسائل پر بات چیت شروع کر کے بے جا طور پر جوش میں آ کر اور اپنے نقطہ نگاہ کو ٹھیک ثابت کرنے کے لیے گرما گرم طویل بحث و مباحثہ شروع کر دیتے ہیں اس سے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور کمزوری واقع ہوتی ہے۔

۱۴۔حرص:

گناہ کئی طرح کے ہیں اور بے شمار ہیں ۔لیکن حرص کو پاپ کا باپ کہا جاتا ہے ۔حریص آدمی جائز ناجائز مناسب غیر مناسب میں کوئی تمیز نہیں کرتا ۔وہ اپنے ضمیر کا خون کر کے جیسے تیسے اپنی مطلوبہ چیز کو حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے کہ اس سے دل میں نقاہت پیدا ہوتی ہے۔

زیادہ مال و زر والے آدمیوں میں شاید ہی کوئی خوش قسمت انسان ہوگا جس کو اللہ کی رحمت سے نیک ہدایت ملی ہو اور کافی دیر تک زندہ ہو ورنہ عام طور پر تو تمگر آدمی جلد موت کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ اوّل تو کمانے میں وہ اپنے جسم اور دماغ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں پھر کمائے ہوئے مال کو محفوظ رکھنے میں دماغ سوزی کرتے ہیں پھر نقصان ہونے کی صورت میں یا روپیہ ضائع ہو جانے کی صورت میں ان کے اعصاب پر ایسی کاری ضرب لگتی ہے کہ وہ اس سے جانبر ہی نہیں ہو سکتے اور دنیا سے بڑی چھوٹی عمر میں چل بستے ہیں اس لیے روپیہ کمانے کے خیال کو وبال جان نہیں بنانا چاہئے۔ اپنے اخراجات کو کم کرو۔ سادہ زندگی بسر کرو، سادہ کھاؤ پیو، سادہ پہنو، اپنی کمائی سے کچھ پیسے بچا کر رکھو تا کہ بیکاری یا بیماری اور بڑھاپے کے وقت کام آسکیں۔

۱۵۔خوف:

کوئی ایسا کام نہ کرو جو خوف پیدا کرے کیونکہ خوف سے دل میں بہت جلد کمزوری آتی ہے اگر یک لخت کوئی خطرناک افواہ پھیلے تو کس طرح لوگوں کے منہ زرد ہو جاتے ہیں۔ دل اپنا کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ خون کا دورہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ چہروں پر زردی چھا جانے کی یہی وجہ ہوتی ہے۔

۱۶۔زندگی کے تاریک پہلو:

بعض لوگ زندگی کے روشن پہلو کی طرف نگاہ نہیں ڈالتے ہمیشہ تاریک پہلو ہی دیکھتے ہیں۔ اس سے دل میں تازگی اور شگفتگی نہیں آتی۔ بلکہ افسردگی طاری رہنے سے دل میں سخت کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔

۱۷۔کشمکش و پیچ میں رہنا:

جو آدمی مستقل مزاج نہیں ہوتے وہ ہمیشہ متذبذب حالت میں رہتے ہیں۔ ان کا دل بھی مضبوط نہیں ہوتا۔ بلکہ پس و پیش کی عادت دل کو کمزور کر دیتی ہے۔

۱۸۔ چڑ چڑا پن:

چڑچڑے مزاج کا آدمی نہ کبھی خوش رہ سکتا ہے نہ دل میں استقلال لا سکتا ہے ۔ اس لیے لمبی عمر پانے کے لیے ان تمام عیوب اور نقائص سے بچنا چاہئے ۔تا کہ دل مضبوط رہے اور جسم کو دیر تک کھڑا رہنے میں مدد دے۔آج کل جو ہارٹ فیل ہو کر موت کے واقعات ہو رہے ہیں ان کا سبب مندرجہ بالا اسباب ہیں جو آدمی ان کمزوریوں اور خامیوں کو نزدیک نہیں آنے دے گا تندرست رہے گا اور طویل عمر پائے گا۔

وقت کی اہمیت

وقت اللہ تعالٰی کا بیش بہا عطیہ ہے ۔ ہماری زندگی کا دورانیہ لمحوں سے عبارت ہے۔سیکنڈ،لمحہ اور دن ،دن سے جڑ تا ہے ہفتہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اور مہینہ سال کا مجموعہ کا نام ہے۔دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے اور ابدی ٹھکانہ آخرت ہے۔دنیا کی زندگی غفلت میں گزاری تو آخرت خراب ہو گئی۔دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے نیکی کے بیج بوئیں،غفلت سے توبہ کریں۔ آپ کو عبث پیدا نہیں کیا گیا۔سستی میں اور عیش کوشی میں وقت برباد کر دیا تو دین و دنیا اور آخرت برباد ہو جائیں گے جن کی زندگی بامقصد ہوتی ہے وہ وقت کی قدر و منزلت جانتے ہیں۔انفرادی اور اجتماعی طور پر زوال کا عمل وقت کی ناقدری سے شروع ہوتا ہے۔زندہ قومیں ایک ایک لمحہ کو متاع جان سمجھتی ہیں۔

جذبہ اِنتقام

(پیر خان توحیدی)

انتقام عفو در گذر کا اُلٹ ہے۔ انتقام کے معنی بدلہ لینا اور عفو در گذر کا مطلب معاف کر دینا۔ اگر چہ اسلام میں انتقام لینے کی اجازت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ اگر معاف کر دیا جائے تو وہ زیادہ بہتر اور زیادہ افضل ہے۔ لیکن انسان کی فطرت بھی عجیب ہے۔ اگر اِس کے ساتھ کوئی نیکی کرے تو وہ اِس کے معاوضے کیلئے سالہا سال بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ بھول ہی جاتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ برائی کی جائے تو جلد از جلد انتقام لینا چاہتا ہے۔ بدی کے مکافات کا جذبہ اِس کے دل میں بہت جلد پیدا ہوتا ہے اور بری طرح پیدا ہوتا ہے۔ اِنتقام کا جن اِس کے حواس پر چھا جاتا ہے آسمانی فرشتے **واعفو واصفحوا** کی صدا بلند کرتے ہیں اور **والکاظمین الغیظ** کے نعرے لگاتے ہیں لیکن اِسے کچھ سمجھ نہیں آتی کچھ سنائی نہیں دیتا اِنتقام کا جن اِسے بہرا اندھا بنا دیتا ہے اور وہ انتقام لینے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔

بارگاہِ ایزدی کا قانون ہے کہ بدی کی سزا بدی کے برابر اور نیکی کی جزا دس گناہ دی جاتی ہے لیکن انسانی فطرت کا قانون اِس کے برعکس ہے۔ انسان اگر کسی نیکی کا بدلہ دیتا ہے تو اِسی نیکی کے بقدر یا اِس سے بھی کم لیکن بدی کا بدلہ وہ دس گناہ بلکہ کئی گناہ زیادہ لینا چاہتا ہے۔ اگر کوئی اِسے تم کہتا ہے تو وہ اسے تو کہتا ہے اور جو اِسے تو کہتا ہے تو یہ اِس کا جواب گالی سے دیتا ہے پھر اِس کا جواب زبان کی بجائے ہاتھ سے دیتا ہے۔

اِنتقام لینے کی طرف انسان بالطبع میلان رکھتا ہے اور ایسا میلان کہ اِس کی برابری نہیں کر سکتا اِس لئے اس کی روک تھام میں زیادہ اہتمام ضروری ہے۔ اِنتقام ایک وحشیانہ عدل ہے قانون نہیں۔ قانون کا کام یہ ہے کہ اِنتقام کی راہ بند کرے۔ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ قانون سے تجاوز کرتا ہے لیکن جو شخص اِس کا عوض لیتا ہے وہ قانون کو معطل کرتا ہے

دشمن سے انتقام لینے میں آدمی اس کے برابر بلکہ اس سے بدتر ہو جاتا ہے۔ مگر معاف کرنے میں اس سے برتر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا قول ہے کہ آدمی کی دانائی غصے کو ٹالتی ہے اور یہی اس کی عظمت کا نشان ہے کہ وہ دشمن کی خطا سے درگذر کرے۔ دانشمند حال اور مستقبل کی طرف توجہ کرتے ہیں ماضی کی باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ معاف کرو اور بھول جاؤ کے زریں مقولے پر ان کا عمل ہے۔ جن برائیوں کی سزا قانوناً نہیں مل سکتی اگر ان کا خفیف سا عوض لے بھی لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر کہیں اس حد تک نہ پہنچ جائے جو قانوناً انتقام لینے والے کو مجرم بنا دے اور وہ سزا کا مستحق ٹھہرے جس سے ایک اور دشمن قانون پیدا ہو جائے جس کیلئے پنجابی کی ایک مثل مشہور ہے کہ پرکھ کا مارا ترک کو جائے یعنی غصہ کا مارا دوزخ کو جائے۔

دراصل اِنتقام ہمیشہ غصہ کی حالت ہی میں لیا جاتا ہے اگر غصہ پر قابو پا لیا جائے تو اِنتقام کا جذبہ بھی منہدم ہو جاتا ہے بزرگوں کا قول ہے کہ غصہ کی حالت میں جو بھی کام کیا جاتا ہے وہ کبھی بھی درست نہیں ہوتا۔ اِس کا انجام ہمیشہ خطرناک اور پشیمانی کا باعث بنتا ہے" خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ" بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ اپنی شہرہ آفاق کتاب تعمیر ملت میں غصہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غصہ ایک طبعی اور نہایت شریف جذبہ ہے۔ جس میں غصہ نہ ہو بے شرم، بے غیرت ہوتا ہے۔ ایسا آدمی دشمن کے مقابلہ میں نہ اپنی جان و مال کی حفاظت کر سکتا ہے اور نہ ہی دین و مذہب کو بچانے میں اس کی رگِ حمیت جوش میں آ سکتی ہے لیکن یہی غصہ جب ضرورت سے بڑھ جاتا ہے اور عقل و حواس پر غالب آ جاتا ہے تو اس سے زیادہ کمینہ اور نقصان دہ کوئی صفت نہیں۔ انسان کی شرافت اور بزرگی عقل کی وجہ سے ہے لیکن غصہ کی حالت میں عقل غائب ہو جاتی ہے اور انسان جانور سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتا ہے"۔ اِس حالت میں اُسے اچھائی اور برائی میں کوئی تمیز نہیں رہتی اور وہ اِنتقام لینے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور بڑھ چڑھ کر اِنتقام لیتا ہے لیکن اس کے عوض جو قانونی سزا خود اِس کو بھگتنی پڑے گی اِس کے مقابلہ میں یہ طریق انتقام اور جوش غضب نہایت گراں پڑتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے آپ سے اِنتقام لیتا ہے۔ یہ امر تحقیق ہے کہ جو شخص

اِنتقام کے درپے رہتا ہے۔وہ اپنے ہی زخموں کو ہرا رکھتا ہے۔اگر وہ درپے اِنتقام نہ رہتا تو یہ زخم بھر کر خود بخود اچھے ہو جاتے۔بہترین اور سخت ترین انتقام یہ ہے کہ اپنے دُشمنوں کے ساتھ نرمی اور شیریں کلامی کے ساتھ اِن کی ہڈیوں کو توڑ دو اور اِن کے سر پر کوئلے جلا کر ان کی روح کو مجروح کرو اور ان کی خطائیں اور زیادتیاں معاف کر کے خوشیوں کو پروان چڑھاؤ۔اِنتقام استقائے روح ہے کہ اِس سلسلہ میں ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اِس سے خود ہم ہی کو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔

جو شخص اِنتقام لینا چاہتا ہے وہ برائی کرنے والے سے زیادہ برا ہوتا ہے۔اِسی جذبہ انتقام کی بدولت سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔خاندان برباد ہو جاتے ہیں۔زندگی کے تمام پروگرام زیروزبر ہو جاتے ہیں۔لہٰذا اِنسان کی بہتری اِسی میں ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے انتقام اور کینہ کو نکال کر پھینک دے۔دراصل انتقام لینا وہ پہلی حرکت ہے جو شیطان نے آدمؑ سے کی۔ لہٰذا انسان سے شیطانی کام کرانے والے انتقام سے زیادہ سے زیادہ اور کیا کام ہو گا۔جذبہ انتقام کا ایک واقعہ جو تقریباً پندرہ بیس سال قبل ایبٹ آباد کے نواحی گاؤں ''مورکلاں'' میں پیش آیا۔ اُس کی تفصیل قارئین کیلئے پیش کرتا ہوں۔مذکورہ گاؤں کی ایک عورت آبادی کے قریب ایک پہاڑی پر چڑھ کر ایک چھوٹے درخت کی شاخیں کاٹ رہی تھی۔عورت کے خاندان کا ایک مرد بھی وہاں پہنچ گیا۔اُس نے عورت سے کہا کہ یہ درخت اُس کے حصہ میں ہے لہٰذا اِس کی شاخیں کاٹنا چھوڑ دے۔عورت نے اُس کی بات نہ مانی اور کہا کہ یہ درخت اُن کے حصہ میں ہے۔اِس پر دونوں کے درمیان تلخ کلامی شروع ہو گئی۔عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جسے سن کا عورت کا خاوند جائے وقوع پر پہنچ گیا اور عورت کے ساتھ تلخ کلامی کا انتقام لینے کیلئے اِس شخص کی پٹائی کر دی چونکہ آبادی قریب ہی تھی۔چیخ و پکار سن کر دونوں طرف سے خاندان کے لوگ بندوقیں لئے موقع پر پہنچ گئے۔دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔سات افراد جن میں دو عورتیں اور پانچ مرد موقع پر ہلاک ہوئے اور کچھ زخمی بھی ہو گئے یہ ہلاکتیں مزید بڑھ سکتی تھیں لیکن گاؤں کے بڑوں نے درمیان میں پڑ کر اِس لڑائی کو کنٹرول کیا وہ درخت جواب جوان ہو گیا ہے ابھی تک وہیں کھڑا ہے

لیکن جذبہ انتقام کے جن نے آناً فاناً سات انسانوں کا خون کرا دیا۔ اِن سب متوفیان کی قبریں بھی سڑک کے بالکل کنارے پر واقع ہیں جو ہر آنے جانے والے کیلئے عبرت کا نشان ہیں۔ اِنتقام ایک ایسا جذبہ ہے کہ اِس میں اپنے ہی مزاج کا زہریلا مادہ اپنے اوپر اثر کرتا رہتا ہے۔ اگر تم پورا انتقام نہیں لے سکتے تو فی الحال اِس تکلیف میں مبتلا رہو گے اور اگر پورا عوض لے سکتے ہو تو آئندہ خود سخت ترین رنج اُٹھاؤ گے۔ اِنسان کیلئے اِنتقام سے زیادہ اور کوئی چیز گزند رساں نہیں جو اِس کو خود اپنے ہاتھ سے پہنچتا رہتا ہے۔

جب اِنسان کے اندر انتقام کی آگ بھڑکتی ہے اور وہ بدلہ لینے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی قوتوں کا جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اِس کے اندر کونسی ایسی طاقت موجود ہے جسے وہ حریف کے خلاف کامیابی سے اِستعمال کر سکے پس انسان میں جو خاص طاقت ہوتی ہے وہ اِسے استعمال کر کے اپنے حریف کو نقصان پہنچاتا ہے اور اِنتقامی جذبہ کو تسکین دیتا ہے چنانچہ ایک تنومند اور طاقتور انسان جب کسی سے اِنتقام لینا چاہتا ہے تو اِس کی رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے اِس کے بازوؤں کو جنبش ہوتی ہے اور اپنے حریف کو مغلوب الغضب ہو کر جسمانی ایذاء پہنچاتا ہے اور اپنے دل کا غبار نکالتا ہے اور اگر کسی شخص میں یہ طاقت نہیں ہوتی تو وہ دوسری قوتوں سے اِس جذبہ کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ستانے والے سے انتقام لینے کی طاقت نہیں رکھتے ایسے بے کسوں کا جب دل دُکھتا ہے تو وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے منہ سے اِک آہ نکلتی ہے جس کا استقبال خود حق تعالیٰ کرتے ہیں یہی انتقام سب سے سخت ہوتا ہے اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی پھر یہ آہیں بجلیاں بن کر اہلِ ظلم کے خرمن حیات پر گرتی ہیں لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان صبر و ضبط کے ساتھ اپنے معاملات عدالت ایزدی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اگر لوگوں کو صبر و تحمل کی عادت ہو جائے اور وہ واقف ہو جائیں کہ معاف کرنے کی جو لذت ہے وہ انتقام میں نہیں۔ اِنتقام کا جذبہ جب ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے تو اِس انجام و عواقب کو سوچ لیا جائے تو بڑی حد تک اِنتقام کی آگ فرو ہو سکتی ہے اور ہمارے قلوب

بغض وعداوت کی آلودگیوں سے نجات پاسکتے ہیں۔

حکایت:۔ایک نیک دل شخص نے اپنے اکلوتے فرزند کو ایک سو اشرفی دے کر بسلسلہ تجارت سفر پر روانہ کیا۔قضا کار پہلی ہی منزل پر ایک ڈاکو نے اِسے قتل کر کے اس کا تمام مال لوٹ لیا چند راہروؤں نے ڈاکو کا تعاقب کیا لیکن وہ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مقتول کے گاؤں میں اس کے باپ ہی کے گھر پہنچ گیا اور تمام وارداتِ قتل وغارت سنا کر اِس سے چند روز کیلئے پناہ مانگی تا کہ خطرے کا وقت ٹل جائے اور اسے اس خدمت کے عوض مال وغنیمت میں سے نصف حصے کا لالچ بھی دیا۔نیک دل والد نے تھیلی اور مقدار رقم سے صحیح اندازہ لگا لیا کہ یہ میرا بیٹا ہی قتل ہوا ہے۔مقتول کے باپ نے تین روز تک اِس کی نہایت خاطر تواضع کی اور چوتھے روز اس نے قاتل سے باچشم نم دست بستہ عرض کی کہ جس نوجوان کو تم قتل کر کے اور اس کا مال لوٹ کر لائے ہو فی الحقیقت وہ میرا ہی اکلوتا بیٹا تھا۔بہتر ہے کہ آپ اب یہاں سے تشریف لے جائیں کیونکہ خطرے کا وقت گزر چکا ہے اور مجھے یہ خطرہ ہے کہ مبادا شفقت پدری وفطرتِ انسانی سے مجبور ہو کر کسی وقت میرے جذبات انتقام جوش میں آ جائیں اور میں مغلوب الغضب ہو کر تمہیں قتل کر ڈالوں اور ثواب صبر سے محروم رہ کر اُلٹا گرفتارِ عقوبت ہو جاؤں۔چنانچہ قاتل فرزند کو مع مال غنیمت بغیر کسی قسم کے اظہار رنج رُخصت کر دیا۔

(حاصل مضمون: **عفو درگزر بهتر هے انتقام سے**)

حقیقت انسان

(کیپٹن واحد بخش سیال)

حیات انسانی کے کئی پہلو ہیں۔ایک یہ کہ انسان تعین ثانی اور خلاصہ کائنات ہے۔
تعین اوّل حقیقتِ محمدیہ ﷺ ہے جسے سابقہ مذاہب کے اکابر اور یونانی فلاسفر لوگوس LOGOS کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ مقام وحدت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حقیقت محمدی کی تخلیق فرمائی اور حقیقت محمدیہ کے نور سے ساری کائنات کو پیدا فرمایا اور چونکہ حضرتِ انسان اشرف المخلوقات ہوکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس کا نائب یا خلیفہ مقرر ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے کائنات کا خلاصہ بنایا یعنی جو کچھ کائنات میں بطور تفصیل موجود تھا انسان میں بطور اجمال بھر دیا۔اور بجاطور پر وہ خلیفہ اللہ VICEGERENT بننے کا مستحق ہوا۔ چونکہ جو کچھ کائنات میں بالتفصیل موجود ہے انسان میں بالاجمال موجود ہے۔
اس حقیقت کو شاعرانہ اور عاشقانہ انداز میں حضرت مولانا رومؒ نے یوں بیان فرمایا ہے:

باده از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما هست شد نے ما ازو

(شراب میں مستی کہاں سے آئی ،ہماری ہی مستی اس کے اندر ہے اور قالب انسانی کہاں سے زندہ ہوا ہم ہی تو تھے جس سے آدم کی مٹی کا خمیر بنایا گیا)

اسی لئے کائنات کو عالم کبیر MACROCOSM اور انسان کو عالم صغیر MICROCOSM کہا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اربعہ عناصر یعنی آب وآتش باد وخاک کا مجموعہ ہے اگر چہ ان عناصر کی باہمی دشمنی ہے لیکن کمال حکمت سے خلاق عظیم نے ان متضاد عناصر کو انسان کے اندر یکجا جمع کر کے اسے دولت عقل سے نوازا ہے تا کہ ان سب میں اعتدال پیدا کر سکے اور

اس دخانی کشتی (جسم) پر سوار ہو کر منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

حیات انسانی کا تیسرا اور سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کو روح و جسم کا مجموعہ بنایا گیا ہے۔ اگرچہ روح کی بھی کئی قسمیں ہیں مثلاً اوّل روح حیوانی جو انسان سمیت سب جانوروں میں مشترک ہے دوم روح انسانی یا روح ملکوتی اور سوم روح القدس۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب کو روح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ روح عالم بالا یا عالم قدس کی چیز ہے اور آدمی کو عالمِ قدس کی جانب کشش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (میں نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی) صیغہ مضارع سے ماضی کے معنی لئے گئے ہیں) جسم عالم ناسوت یعنی اس خاکی دنیا کی چیز ہے اور اس کی کشش عالم سفلی کی طرف ہے۔ (ہر چیز کا رجوع اپنی اصلیت کی طرف ہوتا ہے) لہٰذا انسانی زندگی روح اور جسم کے مابین دائمی کشمکش کا نام ہے اور یہی اس کا امتحان ہے لیکن امتحان میں کامیاب ہونے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطاء فرمائی ہے تاکہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ نیز عقل کو مدد دینے کی خاطر اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام مبعوث فرماتے رہے تاکہ منزل مقصود کی طرف مزید رہنمائی ہوتی رہے۔

آئینہ حق نما:

روح اور جسم کو یکجا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ نور اور جسم کی تاریکی کو یکجا کر کے ایک ایسا آئینہ بنایا جائے کہ جس میں اسماء و صفات حق کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور محبوب حقیقی اپنا حسن و جمال اس آئینہ کے اندر دیکھ سکے۔ فرمان ہوتا ہے:

(میں ایک مخفی خزانہ تھا یعنی جمیع کمالات حسن و جمال کا خزانہ تھا مجھے اس بات کی حب ہوئی کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا) نور و ظلمت کے اس اجتماع سے آئینہ تیار کرنے اور اس آئینہ (مجموعہ کمالات یعنی انسان) کو خلیفۃ اللہ بنا کر دنیا میں بطور نائب حق مامور کرنے کو ایک اور آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا۔لیکن انھوں نے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اُٹھالیا۔ بے شک وہ ظلومی اور جہولی تھا) اور امانت کو آسمان یعنی آسمان والے فرشتے اس لئے نہ برداشت کر سکے کہ وہ سراپا نور تھے اور زمین اور پہاڑ اس لئے نہ اُٹھا سکے کہ وہ سراپا ظلمت تھے۔لیکن چونکہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ تھا اس کا ایک پہلو نورانی اور ایک تاریک ہونے کی وجہ سے یہ مکمل آئینہ بن گیا اور محبوب حقیقی کے حسن و جمال کا عکس قبول کرنے کے قابل ہو گیا عکس کا قبول کرنا کیا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متصف ہونے کی صلاحیت کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ (میں دنیا میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں) کے مصداق وخلافت ارضی سے نوازا گیا۔ یہی خلافت یا نیابت الٰہیہ وہ امانت ہے جس کا انسان حامل ہوا۔بعض لوگ ظلوماً جہولاً سے ظالم اور جاہل مراد لیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں حضرت انسان کی تعریف فرمارہے ہیں نہ کہ مذمت جس امانت کو فرشتوں، زمین اور پہاڑوں نے اُٹھانے سے انکار کیا اگر حضرت انسان اسے قبول کر لے تو یہ کام قابل ستائش ہونا چاہئے یا قابل مذمت۔

خواجہ حافظ شیرازی نے شاعرانہ انداز میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زوند

شانِ محبوبیت:

حضرت غوث الاعظم قدس نے اپنے الہامات جمع کئے ہیں اور سید محمد گیسودرازؒ نے ان کی شرح لکھی ہے۔یہ شرف مطلوبیت اور محبوبیت اُسے کیسے نصیب ہوا۔اس وجہ سے اس کے اندر حق تعالیٰ کے اسماء وصفات اور کمالات حسن و جمال کا پرتو ہے۔

مقصد حیات:

قرآن حکیم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو بجز اس کام کے کہ وہ میری عبادت کا حق ادا کریں''۔ قرآن عظیم کی ہر آیت میں ایک جامعیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور اس باطن کا ایک باطن ہے یہاں تک کہ سات باطن ہیں۔ چنانچہ آیت مذکور میں جہاں اللہ تعالیٰ عوام الناس کے لئے اطاعت و بندگی کا حکم فرماتے ہیں وہاں خواص اور خاص الخاص کے لئے بلند ترین منازل قرب پر پہنچنے کا اشارہ فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو تفسیر قرآن میں خاص ملکہ رکھتے تھے فرماتے ہیں کہ **لیعبدون** سے مراد ہے قرب و معرفت حاصل کرنا۔ یاد رہے کہ جب انسان فناء کے استغراق سے نکل کر بقا کی ہوشیاری میں واپس آتا ہے وہ حدیث نبوی **تخلقو با خلاق اللّٰہ** کے مصداق اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے متصف ہو کر **لی یسمع و بی یبصرو** کے مقام پر پہنچ کر نیابت الٰہیہ اور خلافت حقہ کے فرائض انجام دیتا ہے یہ دوئی قائم ہے جہاں ہر انسان بطور انسانِ کامل حقیقی معنوں میں عبد بن کر حق عبودیت ادا کرتا ہے۔ اس لئے فنا کے بعد مقام دوئی میں واپس آنے کا دوسرا نام مقام عبدیت یا مقام عبودیت بھی ہے اور یہی مقام انسانی عروج کا سب سے بلند ترین مقام ہے اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام صفی اللہ، حضرت نوح علیہ السلام کو نجی اللہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو عبدہٗ و رسولہٗ کے لقب سے نوازا گیا ہے لہٰذا اس آیہ پاک کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو مقام عبدیت پر پہنچنے اور فرائض خلافت الٰہیہ انجام دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ بلند ترین

مقام ہے کیونکہ فنا میں رہ کر آدمی ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاتا ہے۔اور رہ دنیاوی امور سر انجام نہیں دے سکتا عیسائی، ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا انسانی کمال یہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے ذات میں فنا ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں لیکن اسلام نے **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی** کا نعرہ مار کر انسان کو عروج انسانی کی آخری منزل پر پہنچا دیا وہ منزل کہ جہاں تک اس سے پہلے کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی۔

مقصد حیات کا تعین ایک اور آیت سے بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''عبادت کرتا رہ اپنے ربّ کی یہاں تک کہ مقام یقین حاصل ہو جائے۔''

اب اس عبادت سے کیا مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات میں یقین تو پہلے ہی تھا تو ہی عبادت شروع کی پھر اس کے کیا معنی کہ عبادت کرتا رہ بعض مفسرین یقین سے موت مراد لیتے ہیں لیکن یہ تو تاویل ہوئی یقین سے مراد وہی حق الیقین ہے جس کا ذکر دوسرے باب میں ہو چکا ہے وہی مقام فنافی اللہ جہاں پہنچ کر ذات حق میں سالک ایک ہو جاتا ہے اور اسی وقت کے لئے عارضی طور پر عبادت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔لیکن فنا سے نکل کر بقا اور عبدیت میں آنے کے بعد پھر عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔یاد رہے کہ فنافی اللہ عرصہ دراز تک قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھولنے سے وہ حالت رفع ہو جاتی ہے۔اگر رہ بھی جائے تو عبادت میں حارج نہیں ہوتی جو لوگ ہمیشہ کے لئے ذاتِ حق میں مستغرق ہو جاتے ہیں وہ کم ظرف ہوتے ہیں جو ایک دو پیالے پی کر مست ہو جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ اُمت محمدیہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کو عرفِ عام میں مجذوب کہتے ہیں۔اُمت محمدیہ ﷺ میں کثرت ان بلانوش حضرات کی ہے جو پیالہ نہیں، صراحی نہیں، ندی نہیں، نالہ نہیں، دریا نوش کر جاتے ہیں اور دم نہیں مارتے۔اس کیفیت کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے ایک کافی میں یوں بیان فرمایا ہے:

تو نژیں جو دریا نوش ہن
پر جوش تھی خاموشی ہن
اسرار دے سرپوش ہن
حالت رہن مارن نہ ٹیک

''اگرچہ سالکین راہِ حقیقت دریا پر دریا نوش کر جاتے ہیں لیکن جوش وخروش کے عالم میں خاموش رہتے ہیں ۔اسرارِ الٰہی کا دریا ان کے قلوب میں موجزن ہوتا ہے لیکن ذرہ بھر اظہار نہیں کرتے ۔'' مقصدِ حیات کا تعین ایک اور آیت میں یوں کیا گیا ہے:

''اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو) اس میں بھی وصولی الی اللہ اور قرب ومعرفت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

نیز فرمایا جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی کے عوض فروخت کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان بندوں سے کمال شفقت سے پیش آتے ہیں ۔مولانا اشرف علی تھانویؒ جن کو انجان لوگ وہابی کہتے ہیں ،فرماتے ہیں کہ اس آیت کو ہم ہمیشہ پڑھتے تھے لیکن حقیقی معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے جب ہم نے اپنے پیرو مرشد کی غلامی اختیار کی ہے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس آیت میں معرفت کے چاروں مقام یعنی فنا فی اللہ ،بقاباللہ ،رضا الٰہی اور عبودیت موجود ہے ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رضائے حق تعالیٰ کی خاطر اپنے نفوس کو یعنی اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں اور مقام فنا فی اللہ حاصل کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوتا ہے ۔یہ مقام رضا ہے جو بعض صوفیائے کرام کے نزدیک سب سے بلند مقام ہے ۔پھر کیا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ **روف العباد** ہو جاتے ہیں رافت کہتے ہیں کمال شفقت کو اور کمال شفقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو مقام محبوبیت دے دے اور لفظ عباد سے مراد مقام عبدیت ہے یعنی جب آدمی فنا سے نکل کر بقاء میں پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں اور اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں ۔

مقصد حیات احادیث نبوی ﷺ کی رو سے:

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن عظیم نے جو مقصد حیات متعین کیا ہے۔ احادیث نبوی ﷺ میں اس سے مختلف مقصد نہیں ہو سکتا کیونکہ آں حضرت ﷺ سے بہتر قرآن مجید کو کسی نے نہیں سمجھا لیکن مقصد حیات کو زیادہ سے زیادہ آیات و احادیث سے ثابت کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ بعض علمائے کرام ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک مقصد حیات صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم ہو جائے تا کہ ان پر عمل کر کے دوزخ سے بچ سکیں اور بہشت میں جا سکیں۔ یہ تو نہایت ہی کم ہمت اور ادنیٰ لوگوں کا مقصد حیات ہے کیونکہ جب تک عشق محبت کا ولولہ پیدا کر کے حق تعالیٰ کی تہہ دل سے اور کمالِ محبت سے عبادت نہ کی جائے طلبِ بہشت اور خوفِ دوزخ ایک نفسانی خواہش رہ جاتی ہے۔ یہ دوسرے معنوں میں نفس پرستی ہے حق پرستی نہیں۔ اسی خلوص نیت کی بنا پر تو ہمارے رند شاعر مرزا غالب چلا اُٹھے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

ایک دفعہ حضرت رابعہ بصریؒ جوش کے عالم میں ایک ہاتھ میں آگ کی مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا لوٹا لئے جا رہی تھیں کسی نے پوچھا کہاں جا رہی ہو، فرمایا دوزخ کو بجھانے اور بہشت کو آگ لگانے جا رہی ہوں کیونکہ سب لوگ دوزخ کے ڈر سے اور بہشت کے طمع پر عبادت کرتے ہیں خدا کے لئے خالص عبادت کوئی نہیں کرتا۔

ایک حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو دوست بنانا جائز ہوتا تو میں ابو بکرؓ کو دوست بناتا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت کا تعلق ہونا چاہئے نہ کہ شریعت کے احکام معلوم کر کے دوزخ سے بچنے اور بہشت حاصل کرنے کی تدابیر۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا قرب و وصل ہوتا ہے کہ نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی وہاں پر پہنچ سکتا ہے یہ عرفان کا بہت بلند مقام ہے جس کے حصول کے لئے آں حضرت ﷺ کے اتباع اور روش میں ساری امت کو کوشاں ہونا چاہئے۔

نیز آنحضرت فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے قرب و وصال کا مشتاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قرب وصال کا مشتاق ہوتا ہے نیز فرمایا: جو شخص میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں، نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم نہیں دیکھ سکتے تو وہ تم کو دیکھ سکتا ہے۔ اس حدیث پاک میں رویت حق کے حصول کی تاکید کی گئی ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں جب صحابہ نے عرض کیا کہ حضور دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے سے بڑا جہاد کیا ہے تو فرمایا: جہاد بالنفس (نفس کے ساتھ جہاد)۔ آنحضرت ﷺ نے نفس سے جہاد کا نام جہاد اکبر رکھا اور اس کی فضیلت دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ کرنے سے بھی زیادہ ہے اور یہی وہ جہاد ہے جس میں آں حضرت ﷺ اور صحابہ کرام رات دن مصروف رہتے تھے تا کہ نفس کا غلبہ دور ہو اور قرب الی اللہ کی دولت نصیب ہو۔ لیکن افسوس کہ ظاہر میں حضرات آں حضرت ﷺ کے ظاہری اسوۂ حسنہ کا اتباع تو بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں لیکن آپ کے باطنی اسوہ حسنہ کا اتباع بالکل نہیں کرتے۔ آپ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو شدید عشق و محبت کا تعلق ہے اور جس کی بدولت آپ فنا و بقا اور قرب و معرفت کے بلندترین مراتب پر متمکن ہو چکے تھے ظاہر بین حضرات اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے کیونکہ ان کا مطمعِ نظر تو حصولِ بہشت ہے ان کو یہ معلوم نہیں کہ اس نیت سے بہشت بھی نہیں ملے گی۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص دیکھتا ہے کہ جو لوگ کسی بادشاہ سے ملنے کی خواہش کرتے ہیں تو بادشاہ ان کو اپنے پاس طلب کر کے محلات میں مہمان رکھتا ہے عمدہ کھانے کھلاتا ہے خدام سے خدمت کراتا ہے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتا ہے تو اس شخص کے دل میں مہمان بننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تا کہ وہ بھی محلات میں رہے اور اچھے اچھے کھانے کھائے۔ لیکن جہاں

پہلے آدمی کی نیت بادشاہ کی محبت اور شوق ملاقات تھی۔ دوسرے شخص کی نیت محض محلات میں رہنا اور اچھے اچھے کھانے کھانا ہے اگر بادشاہ کو دل کی بات معلوم کرنے کی طاقت ہےتو دوسرے شخص کو نزدیک نہیں آنے دے گا کیونکہ اسے بادشاہ کی خواہش نہیں بلکہ اس کے محلات میں رہنے کی ہے۔ لہٰذا آپ خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ جس شخص کی نیت بہشت کے مزے اُڑانے کی ہے وہ بادشاہِ حقیقی کی نظروں میں کہاں مقبول ہوسکتا ہے۔ اس کو نزدیک ہی نہیں آنے دیا جائے گا۔لہٰذا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بجائے بہشت کی محبت دامن گیر ہے وہ تو سلطان محمود غزنوی کی لونڈی سے بھی کم عقل نکلے۔ ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی نے فرطِ جود وسخا میں آ کر اپنا سارا ساز و سامان میدان میں لگا دیا اور اپنے خدام اور درباریوں کو حکم دیا کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے وہ اس کی ملکیت ہوجائے گی۔ اب کیا تھا سب لوگ دیوانہ وار دوڑ دوڑ کر اپنی پسند کی چیزوں پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔ کوئی گھوڑے پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔کوئی ہاتھی پر، کوئی سونے پر، کوئی چاندی پر، اس اثنا میں بادشاہ کی لونڈی آئی۔ بادشاہ نے اُسے دیکھ کر کہا اری تو بھی کسی چیز پر ہاتھ رکھ دے۔ اس نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ عہد کا پکا تھا۔ اب وہ اس کا ہو چکا تھا لہٰذا اس کو اپنے نکاح میں لے لیا اور وہ ملکہ بن گئی۔ دیکھئے کس قدر عقلمند تھی۔ بادشاہ کے مال کی پرواہ نہیں، خود بادشاہ پر نظر ہے۔ یہ ہے مومن کی شان کہ اس کا مقصود اور مطلوب اللہ ہے نہ جاہ،عزت، نہ ملک، نہ مال، نہ بہشت۔ بہشت اس کو ضرور ملے گی لیکن ضمناً ملے گی۔ اگر کوئی شخص اسے منزلِ مقصود یا مطمع نظر بنائے گا تو نہیں ملے گی۔ کیونکہ ظاہر ہے بادشاہ کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا۔حکم ہوتا ہے کہ میری نماز،میرے روزے، میری قربانیوں، میری زندگی اور میری موت کا مرجع اور مقصود تیری ذات ہے۔ اس لئے مشائخ عظام نے کہا ہے کہ دنیا کے تمام مشاغل زندہ رہنے کے لئے ہیں اور زندہ رہنا محبوب کے لئے ہے۔ گویا دنیا کے تمام کام مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ہے ایک مومن کی زندگی کا مقصد۔ اگر کوئی شخص اس کے علاوہ مقصدِ زندگی مقرر کرتا ہےتو وہ مشرک ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن:

(کھانا اس لئے کھایا جائے کہ زندہ رہ سکے نہ کہ زندگی کا مقصد خورد ونوش مقرر کرے)

اب بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہر شخص ولی بن سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ولایت نہایت ہی بلند مقام ہے جو خاصانِ خدا کے لئے مخصوص ہے لیکن آپ کو کس نے بتایا کہ آپ ان میں شمار نہیں ہوتے۔ یہ عشق کی دنیا ہے جس شخص میں عشق زیادہ ہے وہ مقامِ قرب میں پہنچنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے خواہ وہ بظاہر کیسی ہی زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں عشق کی بڑی قدر ہے۔ عاشق کی طلب میں خدا تعالٰی خود رہتا ہے۔ باقی لوگ مرید ہوتے ہیں لیکن عاشق مراد ہوتے ہیں۔ مرید تلاش کرتا ہے اور مراد کو تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر یہ دولت بھی پاس نہ ہو تو یہ بات ضرور حاصل ہوگی کہ جو شخص پہاڑ کی بلندترین چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ کسی بلندی تک تو پہنچ جائے گا یا کم سے کم اس گٹر (گندی نالی) سے تو نکل جائے گا جس میں اُسے خواہشاتِ نفسانی نے ڈال رکھا ہے۔ اسی لئے مولانا روم کا مشورہ یہ ہے کہ

اندریں رہ مے تراش و مے خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

(اس راستے میں جان کی بازی لگادو۔ اور مرتے دم تک کوشش جاری رکھو)

حُبِ الٰہی

(حضرت شیخ عبدالقادر عیسیٰ الشاذلی)

حب الٰہی مقاماتِ سلوک کی انتہاء ہوتی ہے اور یہی منازلِ سلوک کی بلندترین چوٹی ہے' محبت کے بعد اگر کوئی مقام ہے تو وہ اس کا ثمر اور تابع شمار ہوگا۔ جیسے شوق' انس اور رضا وغیرہ۔ اور اسی طرح محبت سے قبل مقامات کا شمار اس کے مقامات میں ہوگا۔ جیسے توبہ، صبر اور زہد وغیرہ۔

محبت کو کسی تعریف میں محدود نہیں کیا جاسکتا جو اس کی وضاحت کر سکے، بلکہ اس کی تعریفات اس میں مزید اخفاء اور پوشیدگی کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ تعریف تو علوم کی' کی جاتی ہیں۔ اور جبکہ محبت علم نہیں بلکہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو محبین کے قلوب پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت سے گزر کر ہی اس کی حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ محبت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے یہ تو سب اس کے آثار ثمرات اور اسباب ہیں۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کی تعریف میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے اس کی حقیقی تعریف کی ہو' بلکہ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر لوگوں نے اس کی تعریف' اس کے نتائج' آثار اور لوازم سے کی ہے۔ محبت وہ صفت ہے جس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ بھی متصف ہے۔ محبت کے بارے میں بہترین قول ابوالعباس صہناجی سے مروی ہے: آپ سے محبت کے بارے میں پوچھا تو آپؒ نے فرمایا کہ غیرت محبت کی صفات میں سے ہے اور غیرت' ستر کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے محبت کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔

ابن دباغ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کی حقیقی تعریف وہی کر سکتا ہے جس نے

اس کا مزہ چکھا ہو''۔اور جس نے اس کا مزہ چکھ لیا'اس کو اپنی خبر نہیں رہتی۔اس لئے کیسے ممکن ہے کہ اس کی تعریف بیان کی جا سکے۔یہ اسی طرح ہے کہ غالب آنے کی وجہ سے اس حالت میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ان دونوں نشوں میں فرق یہ ہے کہ شراب کا نشہ عارضی ہوتا اور اس کا زائل ہونا ممکن ہوتا ہے۔اور نشہ کافور ہونے پر انسان اس کی حقیقت کو بیان کر سکتا ہے مگر اس کے مقابلے میں محبت کا نشہ دائمی ہوتا ہے۔جس نے بھی اس نشہ کو چکھ لیا'اس کا دوبارہ ہوش میں آنا ممکن نہیں۔اس لئے وہ اس کی حقیقت کے بارے میں کیسے خبر دے سکتا ہے؛ جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے:

''شراب پینے والے تو ہوش میں آجاتے ہیں اور عشق دائمی نشے کا نام ہے''

اسی وجہ سے جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش اور شوق و دیوانگی میں دل کا دھڑکنا محبت کہلاتا ہے''۔پھر آپ نے محبت کے کچھ آثار بیان فرمائے۔

ابو بکر کتانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایام حج کے دوران مکہ مکرمہ میں محبت کا مسئلہ چل نکلا'بڑے بزرگوں نے اس کے بارے میں گفتگو فرمائی۔حضرت جنید بغدادیؒ عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ان بزرگوں نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اب تمہاری باری ہے'بتاؤ کیا بولتے ہو؟ آپؒ نے اپنے سر کو جھکایا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔آپ نے فرمایا:''محبّ وہ بندہ ہے جو اپنی ذات سے غافل ہو۔ہمیشہ اپنے ربّ کے ذکر میں مشغول رہے۔اس کے حقوق ادا کرے۔اپنے دل کی نگاہ سے اس کا مشاہدہ کرے۔اس کی ہیبت کے انوار نے اس کے دل کو جلا دیا ہو۔اس نے اللہ کی محبت کا جام طہور پیا ہو۔اگر حرکت کرے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے'اگر ساکن ہو تو اللہ کے ساتھ یعنی اسے مع اللہ کی کیفیت حاصل ہو۔بزرگ' آپ کی گفتگو سن کر رونے لگے۔وہ فرمانے لگے: اس سے بڑھ کر محبت کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔اے تاج العارفین !اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے!!

محبت کی دلیل اور اس کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندہ سے محبت، اور بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی بہت سی دلیلیں ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے''۔ (مائدہ:۵۴)

''اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے''۔ (بقرہ:۱۶۵)

''(اے محبوب!) آپ فرمایئے انہیں کہ اگر تم واقعی محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ''۔(آل عمران:۳۱)

''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ تین چیزیں جس میں ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔

(۲) کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لئے۔

(۳) کفر میں لوٹنے کو اس طرح ناپسند کرے جس طرح وہ نار جہنم میں پھینکے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ادائیگی فرائض سے بڑھ کے میرے نزدیک کوئی چیز محبوب نہیں ہے، جس کے ذریعے بندہ میرا قرب حاصل کرے، میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔اور اس کے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں۔اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو یقیناً میں اسے پناہ دیتا ہوں''۔(بخاری)

''حضرت ابوھریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا 'جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو تو جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر آپ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین میں اس کی مقبولیت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسی طرح اسے زمین میں بھی مقبولیت سے نواز دیا جاتا ہے۔'' (بخاری)

حضرت ابو درداء سے روایت ہے: ''حضرت ابو درداء سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا 'حضرت داؤد علیہ السلام یہ دعا کرتے تھے۔ اے اللہ! میں تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس کی محبت کا جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور اس عمل کا سوال کرتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے۔ اے اللہ! تو اپنی محبت کو میرے نزدیک میری جان، میرے اہل و عیال اور ٹھنڈے پانی کی محبت سے بھی محبوب بنا دے''۔

قرآن و سنت ایسے بیان سے بھرے پڑے ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اور ان کے اعمال و اقوال اور اخلاق سے محبت کرتا ہے۔ جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔'' بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ (بقرۃ:۲۲۲) ''اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا'' (بقرۃ:۲۰۵) ''اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی مغرور شیخی باز کو'' (الحدید:۲۳) ''اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا گمراہوں سے'' (آل عمران: ۵۷) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اپنی محبت کو کثیر احادیث میں ایمان کی شرط قرار دیا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک بھی (کامل) مومن نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ میں اس کے نزدیک اس کے اہل و عیال، مال اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں''۔ اس حدیث پاک میں رسول معظم ﷺ نے اپنے صحابہ کو محبت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک بڑا ارفع و اعلیٰ اور

انتہائی تاثیر کن مقام ہے۔ پہلے آپ ﷺ نے ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فضل و احسان کی طرف کرائی اور پھر وضاحت فرمائی کہ ان کی اللہ سے محبت اس کے محبوب مکرم ﷺ سے محبت کا تقاضا کرتی ہے۔ اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو"۔ رسول اللہ ﷺ نے محبین کو اپنے محبوب کی معیت کی خوشخبری دی ہے حضرت انسؓ سے مروی ہے: "ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ قیامت کب ہوگی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو نے اس کیلئے کیا تیاری کی ہے۔ اس نے عرض کی میں نے اس کیلئے کثیر نماز، روزے اور صدقہ کو جمع نہیں کیا، لیکن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہمیں بھی یہ کیفیت حاصل ہوگی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں۔ یہ ارشاد سن کر ہم انتہائی خوش ہوئے"۔

محبت کے بارے میں کثیر احادیث وارد ہیں جو تمام اس کی فضیلت و عظمت کی طرف مشیر ہیں صحابہ کرام ﷺ جب اللہ اور اس کی محبت کے مقام رفیع پر فائز ہوئے تو وہ ایمان و اخلاق اور ایثار و قربانی میں کمال درجہ تک پہنچ گئے۔ محبت کی حلاوت نے مصائب و آلام کی تلخی کو ان کیلئے مانوس بنا دیا۔ اور جذبہ محبت نے انہیں اپنے محبوب کی راہ میں جان، مال، وقت اور ہر قیمتی چیز قربان کرنے پر مجبور کر دیا۔ تاکہ وہ اپنے محبوب کی محبت اور رضا سے بہرہ ور ہو سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اعمال و احکام کا نام ہے اور محبت اس کی روح ہے۔ اور بغیر محبت کے اعمال بے جان ڈھانچوں کی طرح ہیں۔

(جاری ہے)

عشق رحمت دو عالم ﷺ

(عبدالرشید ساہی)

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طہٰ

حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت ہمارے دین وایمان کا حصہ ہے۔آپ ﷺ کی ذات عالی صفات انسانیت کیلئے مشعل راہ اور وجود پاک ﷺ انسانوں کیلئے مینارۂ نور اور کامیاب زندگی اور آخرت میں نجات کیلئے ایک ماڈل اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہے شاعر کہتا ہے:

؎ کٹ مروں جب تک نہ میں شاہِ بطحا کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمتوں والی آخری کتاب قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:
ترجمہ: ''اے حبیب مکرم ﷺ آپ فرمادیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا اور تمہارے لئے تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے''۔(آل عمران)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد، میاں بیوی اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوجاؤں''۔

؎ کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

گویا جب تک کسی مسلمان کے دل میں کائنات اور عالم خلق کی ساری محبتوں سے

بڑھ کر حضور نبی کریم ﷺ کی محبت نہ ہو تو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ صداقت اور سچائی کے اس مرتبہ پر نہیں ہیں۔ ہم باتوں کو چھپاتے ہیں حقیقت اور غیر حقیقت میں غلط ملط کرتے ہیں۔ اندر کی کیفیات کا ادراک نہیں کرتے اور جو سچائی اندر موجود ہے اس کا اظہار نہیں کرتے ساری ساری عمر نمازیں پڑھتے گزار دیتے ہیں لیکن حق بات بر ملا کہنے کا حوصلہ و جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ دنیاوی سارے خوف اندر موجود رہتے ہیں لیکن خوف خدا پیدا نہیں ہوتا۔

دل دا شیشہ صاف نیں کردا
نت دھوویں میل بدن دا

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سچائی دین کی بنیاد ہے، اگر سچائی نہیں تو آپ کا دین کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں کیونکہ دین سارے کا سارا سچائی اور ایمانداری سے منسلک ہے، جو دین ہم نے اپنا رکھا ہے یہ مولا مرضی کا دین نہیں بلکہ من مرضی کا دین ہے کامیابی اس وقت نصیب ہوگی جب ہم نبی رحمت ﷺ کی اتباع میں آئیں گے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری

ہم نے تو سارے کا سارا دین ثواب کے لیے سمجھ رکھا ہے اصلاح کے لیے نہیں، کردار کے لیے نہیں، حکمرانی کے لیے نہیں بلکہ غلامی کے لیے سمجھ رکھا ہے۔ مسلمان اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ جہاں میں کوئی قوم ذلیل ہو رہی ہے ستم سہہ رہی ہے ظلم کا شکار ہے تو وہ مسلمان قوم ہی تو ہے۔ اس کے باوجود ہم سنبھل نہیں رہے، رشوت خوری دن بدن بڑھ رہی ہے ملاوٹ کا تو نام ہی نہ لیں کوئی چیز بھی خالص میسر نہیں یہاں تک کہ زہر بھی خالص نہیں ملتا انصاف کا کیا پوچھنا

اس کا تو جنازہ بھی پڑھا جا چکا ہے،عدلیہ میں اتنا ظلم ہو رہا ہے کہ بیان سے باہر ہے،جس ملک میں مظلوم انصاف کے حصول کے لیے دھکے کھاتے پھر رہے ہوں وہاں وباء نہ آئے وہاں کرونا کی مرض دوبارہ حملہ آور نہ ہو جہاں ذخیرہ اندوزی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مخلوق پیسے ہاتھ میں لیے پھرتی ہے ضروریات زندگی کی اشیاء نایاب ہو چکی ہیں کبھی آٹا نہیں ملتا تو کبھی چینی بازار سے غائب ہو جاتی ہے کبھی ٹماٹر نہیں ملتا تو کبھی پیاز مارکیٹ سے غائب ہو جاتا ہے اُف ہے ہماری مسلمانی پر ہم سال میں ایک مرتبہ 12 ربیع اوّل پر چراغاں کر کے سرکار رحمت عالم ﷺ کے عاشقوں میں نام لکھوا لیتے ہیں سال میں ایک مرتبہ رمضان شریف کے روزے رکھ کر جنت کے حقدار بن جاتے ہیں محرم الحرام کے دس دن گن کر شہداء کربلا کی یاد میں آنسو بہا کر حوض کوثر کے جام کے حقدار بن جاتے ہیں ۔یہ ہے ہمارا اسلام اور ایمان دوستو! سارے کا سارا اسلام نبی رحمت ﷺ کی اداؤں کا نام ہے آپ ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنے کا نام ہے،ہم ساقی کوثر ﷺ کے قدموں کو نہ چھوڑیں گے جس نے بھی جو پایا ہے اس در سے ہی سے پایا ہے:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

توکل

(حجۃ الاسلام امام غزالیؒ)

توکل کے معنی و مفہوم میں عام طور پر بڑی غلط فہمی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ علم کے لحاظ سے بہت دقیق اور عمل کے لحاظ سے بہت مشکل بھی ہے۔ یوں سمجھئے کہ توکل میں اسباب ظاہری پر اعتبار کرنے کو منع بھی کیا جاتا ہے اور اسباب سے بالکل ہاتھ اُٹھا لینے کا بھی حکم نہیں ہے' اس لیے توکل کے ایسے معنی جو عقل کے بھی مطابق ہوں اور مطلوب بھی ہوں ذرا مشکل کام ہے' اس لیے ہم اس پر توجہ کرتے ہیں۔ توکل کی تعریف میں اکثر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ہم ان سب کو چھوڑ کر امر واقعی کو لیتے ہیں۔

"**توکل**" وکالت سے نکلا ہوا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں "دوسرے پر اعتماد کرکے کام سپرد کر دینا۔" جس کو کام سپرد کرتے ہیں اس کو وکیل کہتے ہیں' اور جو کام سپرد کرتا ہے اس کو متوکل کہا جاتا ہے' یہ قاعدہ ہے اور عادت ہے کہ کوئی بھی متوکل یعنی کام سپرد کرنے والا اُسی وکیل کو کام سپرد کرے گا جس کی طرف سے اُسے اطمینان اور اعتقاد ہوگا' اس کو عاجز و مجبور نہ سمجھتا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ "توکل دل کے اعتماد کو کہتے ہیں" دنیوی معاملے میں متوکل' وکیل میں چار چیزیں چاہتا ہے۔ اول ہدایت' ہدایت سے باریک گوشے پر وکیل کی نظر ہوتی ہے کہ کسی پہلو سے بھی متوکل کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ دوم قدرت' قدرت اس لیے کہ مثلاً ایک شخص نے ایک جھگڑے میں کوئی وکیل بنایا' وکیل جب حاکم کے سامنے اُس شخص کے جھگڑے کو فیصلے کے لیے لے گیا اور خوف' بزدلی' یا حیاء کی وجہ سے اس کے معاملے پر پوری طرح بحث نہ کر سکا تو ظاہر ہے اس کا معاملہ کمزور پڑ جائے گا۔ اس لیے قدرت ضروری ہے۔ تیسرے فصاحت' فصاحت اس لیے کہ جو بات دل میں ہے اس کو بخوبی بیان کرکے متوکل کے توکل کا حق ادا کر سکے۔ چوتھے مکمل شفقت'

یہ اس لیے کہ اپنے اوپر توکل کرنے والے کے معاملے میں کوئی کمزوری نہ چھوڑے بلکہ دل و جان سے اس کی طرف داری کرے، اگر وکیل میں یہ چار باتیں مکمل طور پر ہوں گی تو متوکل کو اس پر پورا بھروسہ ہوگا، ورنہ اس کا دل متردد رہے گا۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر اب اصل توکل پر غور کیجیے جو بندہ اپنے خدا پر رکھتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ اپنے اوپر توکل کرنے والے کے تمام معاملات کو بخوبی جانتا ہے، وہ توکل کے بھید اور مقصد سے بخوبی واقف ہے۔ پھر وہ سب سے بڑی قدرت اور طاقت والا ہے، وہ ایسا حاکم ہے کہ تمام معاملات اسی کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ بندوں پر اس کی رحمت کامل اور اس کی عنایت شامل ہے، امور کو جاننے کے بعد بے شک وہ خدا پر پورا بھروسہ اور توکل کرے گا۔

اتنا جان لینے کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ توکل میں کئی مقامات ہیں۔ بعض وہ ہیں جو ہماری ظاہری سمجھ سے بالاتر ہیں، اور ان پر ہم پہنچ بھی نہیں سکتے۔ یعنی اُن پر پہنچنا ممکن نہیں ہے ہاں مشکل ضرور ہے، مثلاً بچے کو ماں پر توکل ہوتا ہے کہ بھوک لگے تب، کوئی ستائے تب، غرض ہر حال میں اُسے ماں اور صرف ماں یاد آتی ہے، وہ کسی اور طرف توجہ کر ہی نہیں سکتا، کو ماں کی محبت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ پس جو خدا پر ایسا توکل کرلے وہ کسی حال میں بھی سوائے خدا کے کسی کو اپنا سہارا اور مددگار نہ سمجھے گا۔ اس میں بھی ایک مقام اس سے بلند آتا ہے وہ یہ کہ خود کو خدا کے سامنے اس طرح ڈال دے کہ اپنی ہر حرکت، ارادے اور ہر جنبش کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔ مثلاً ایسے بچے کی طرح ہو جو یہ جانتا ہے کہ اگر ماں سے فریاد نہ کرے گا تو ماں خود ہی اسے ڈھونڈ لے گی، اگر وہ ماں کے دامن سے نہ لپٹے گا تو ماں خود ہی اسے اٹھائے گی، اور وہ ماں سے دودھ نہ مانگے تو ماں خود ہی اسے دودھ پلائے گی، مقام توکل اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ متوکل خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے اُس سے سوال اور دعا بھی چھوڑ دے۔ مگر یہ وہ مقامات ہیں۔ جو عوام کے ذہن اور دسترس سے دور ہیں، اس لیے ہم عام توکل سے بحث کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بندے کو توکل کے بعد اسباب اور ظاہری تدبیروں سے کچھ تعلق رہے گا یا نہیں؟ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ

جب ایک شخص نے کسی معاملے میں اپنے وکیل پر اعتماد اور توکل کرلیا تو اب وہ تدبیر جو وکیل کے علاوہ دوسروں سے متعلق ہے' اُسے نہیں کرے گا' مگر جو تدبیر اس کا وکیل بتائے گا اُسے تو کرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً وکیل نے کہا جب تک تو عدالت میں موجود نہ ہوگا میں تیرے معاملے میں کچھ نہ بولوں گا' تو وہ شخص خواہ مخواہ عدالت میں حاضری کے لیے تدبیریں کرے گا، اور ظاہر ہے کہ اس کی یہ تدبیریں اس کا عدالت میں حاضر ہونا کسی طرح بھی توکل کے خلاف نہیں ہے' یہاں وکیل سے بداعتمادی یا توکل نہ کرنے کا الزام اس پر نہیں آئے گا بلکہ غور کیجیے تو توکل کو مکمل کرنے کے لیے کچھ ضروری ہدایات دیں ہیں۔ ''یعنی اس کا عدالت میں حاضر ہونا۔'' اور وہ شخص بھی پورے توکل کے لیے اس تدبیر پر عمل کررہا ہے۔ اگر اس کو اب بھی وکیل پر اعتماد نہ ہوتا یا اس پر توکل نہ ہوتا تو وہ وکیل کے کہنے پر کیوں حاضر ہوتا۔ دوسری مثال تدبیر کی یہ ہے کہ اس شخص کو وکیل کی بعض عادتوں کا علم ہے' جیسے اسے معلوم ہے کہ میرا وکیل عدالت میں اُس وقت بحث کرتا ہے جب اُس کے سامنے مقدمے کی دستاویز موجود ہو۔ اب اس کا توکل تب ہی پورا ہوگا جب وہ اس ظاہری تدبیر پر بھی عمل کرے اور وکیل کی عادت کا لحاظ رکھتے ہوئے دستاویز لے کر حاضر ہو۔ یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں اس کی تدبیر خود عدالت میں آنے یا دستاویز لانے کے بعد ختم ہوگی۔ اب وہ وقت آپہنچا کہ اس کا اطمینان اور اعتقاد صرف وکیل پر رہ گیا ہے' اس تقریر کے بعد تمام اعتراض توکل پر سے ختم ہوجاتے ہیں' توکل کی یہ شرط ہرگز نہیں ہے کہ آدمی تمام تدبیر اور سارے کام سے ہاتھ اُٹھالے اور خدا کے فیصلے کا انتظار کرتا رہے۔

بعضوں کو یہ گمان ہے کہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ نہ بدن سے کوئی کام کرے' نہ دل و دماغ سے کوئی تدبیر سوچے' پھٹے پرانے لباس پہن کر پڑا رہے' یہ بالکل جاہلانہ بات ہے۔ اس سلسلے میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ انسان اپنے اختیار سے جو کوششیں کرتا ہے وہ چار قسم کی ہوتی ہیں۔ اوّل کسی نافع چیز کو حاصل کرتا ہے۔ دوم' حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت کرتا ہے۔ سوم' کسی ایذا دینے والی چیز کو ایذا دینے سے پہلے دفع کرتا ہے۔ چہارم' مصیبت جو اپنے اوپر آگئی ہو اس کو دور کرتا ہے

اب ان چاروں میں توکل کی شرط کیا ہے۔ نافع چیز میں مثال ہے کہ آدمی کے سامنے کھانا رکھا ہوا ور وہ بھوکا بھی ہو مگر اس پر ہاتھ نہ بڑھائے اور کہے کہ میں متوکل ہوں تو یہ توکل کے خلاف ہے۔ اس کو جنون کہتے ہیں کیونکہ خدا نے اس کے لیے قطعی اسباب بنا دیے ہیں' ان کے خلاف نہیں ہوتا۔ اسی طرح بغیر بیج اور محنت کے غلہ طلب کرنے والا مجنوں ہے۔ توکل تو اس علم کو کہتے ہیں کہ ہاتھ، منہ، دانت، کھیت، بیج، مٹی، محنت خدا کی پیدا کی ہوتی ہے اور رکھانا' پانی' کھیت میں غلہ دینا یہ سب اسی کا کام ہے اور اس کا بھی علم ہو کہ ہمیں فلاں مقصد کے لیے فلاں فلاں کام کرنا ہوگا اور توکل اس حالت کا نام ہے کہ باوجود ان ظاہری اعضاء کے ظاہری حرکت کے قلب کا اعتماد یہی ہو کہ کامیابی اور مقصد بہر حال خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری ان ظاہری حرکتوں کے اوپر منحصر نہیں ہے' ہمیں تو اس تدبیر کا حکم ملا ہے' ہم کر رہے ہیں۔ ہم یہ نہ کریں گے تو نہ کھا سکیں گے نہ غلہ پائیں گے کیونکہ بغیر کچھ کیے ہوئے پا جانا خدا کی عادت کے خلاف ہے۔

ایک شخص اپنی ضرورت کی چیز کو حفاظت سے رکھ لیتا ہے تو یہ بھی توکل کے خلاف نہیں ہے۔ اس میں بھی لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں' بعض ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ ایک وقت کھانا کھالیا دوسرے وقت کا کھانا محفوظ نہ کیا بلکہ دوسرے کو دے دیا۔ مگر ہم اُن لوگوں کو دیکھیں گے کہ اگر وہ حفاظت سے نہ رکھیں تو اُن کا ذہن پراگندہ ہوتا ہو' جس سے عبادت میں اور اُن کے مقاصد پر اثر پڑتا ہو تو اُن کو رکھ لینا ہی بہتر ہے بلکہ کسی کے دِل کو اگر کچھ جمع رہنے سے اس قدر سکون ملتا ہو کہ وہ سکون اور دلجمعی سے عبادت میں مصروف ہو سکتا ہے تو اس کے لیے اچھا ہے کہ حفاظت کرے۔ اس کے خلاف توکل کے نام پر عمل کر کے دل کو پریشان نہ کرے' پھر اگر مال یا کسی چیز کے جمع کرنے سے کسی برائی میں نہیں پڑتا اور یہ چیز اسے بھلائی سے نہیں روکتی تو ضرور حفاظت کرے' یا عیال دار اگر اپنے متعلقین کے خیال سے جمع کرتا ہے تو ہرگز توکل سے باہر نہیں ہے۔ ہاں زیادہ حرص وہوس اور بالکل مال اور دنیا پر گرنا توکل ہی کیا! شرافت وانسانیت کے بھی خلاف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دِل کے استغناء کے ساتھ جمع کرنا اور ہر وقت اسی میں

مشغول نہ رہنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔تیسرے موذی چیزوں کے دفع کرنے کی بات ہے ضرر کبھی نفس اور جان پر آتا ہے، کبھی مال پر، کہیں بھی توکل کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے یا مثلاً درندوں، حشرات الارض والے علاقے میں سوجانا، بارش سے گرتی ہوئی چھت کے نیچے سونا اور آگ لگی ہوئی عمارت میں گھسنا، دشمنوں میں خود جانا اور پھر یہ کہنا ہم نے توکل کیا ہے یہ توکل کے سراسر خلاف ہے۔اسی طرح سے جو مصائب سر پر آپڑیں ان کو توکل کے نام پر دفع کرنے کی کوشش نہ کرنا، یہ بھی توکل کے خلاف ہے۔یہاں بھی وہی تفصیل ہے کہ دوا کو مطلق شفاء اور صحت کا سبب نہ مانے، یہ علم رہے کہ خدا نے مرض اور مصیبت میں علاج اور چارہ جوئی کا حکم دیا ہے اور حال یہ ہوا کہ علاج اور دوا کے بعد بھی قلب کو یہ یقین کامل رہے کہ شفاء اور صحت نہ طبیب کے ہاتھ میں ہے نہ دوا علاج سے ممکن ہے۔کارساز کوئی اور ہی ذات ہے۔

پریشانیاں اور ترقی

(خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کا پریم پتر بنام مخدوم ریاض حسین صاحب 25/02/1962)

''اگر آپ غور کریں تو پریشانیاں 10 فیصدی قدرت کی طرف سے ہوتی ہیں اور 90 فیصدی انسان خود اپنے آپ پیدا کرتا ہے۔عقلمندانہ علاج صرف یہ ہے کہ ان پریشانیوں کے نتائج خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور آئندہ کے لیے عبرت حاصل کرے، توبہ کرے اور ایسے کام نہ کرے جس سے پریشانیاں پیدا ہوں۔باقی رہیں وہ پریشانیاں جو قدرت ڈالتی ہے تو ان پر چونکہ اختیار نہیں اس لیے وہ بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنی چاہئیں بلکہ ان پر تو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ نے مجھ کو اس قابل سمجھا کہ آزمائے کیونکہ آزمائش سزا نہیں ہوتی بلکہ ٹریننگ اور تربیت کے لیے ہوا کرتی ہے اور ان کی ہوتی ہے جن کو ترقی دینا مقصود ہوتی ہے۔''

اتحاداہم ترین ضرورت ہے

(مولانا اسجد قاسمی)

احادیث نبویﷺ کے ذخیرے میں اُمت محمدیﷺ کے باہمی اختلافات وانتشار کی پیشین گوئیاں جابجانظر آتی ہیں،اس موضوع کی سب سے مشہور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم محمد عربیﷺ نے ارشادفرمایا:

ترجمہ: ''یہود ونصاریٰ فرقوں میں بٹ گئے،میری اُمت فرقوں میں بٹ کر رہے گی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ ''سوائے ایک فرقے کے سب جہنم میں جائیں گے۔''

مسائل وعقائد اور دینی افکار کے اختلافات تو شروع سے چلے آرہے ہیں اور روز بروز بڑھ رہے ہیں،اس کے علاوہ ملی وملکی،قومی واجتماعی مسائل میں بھی اُمت کا مختلف ٹولیوں میں بکھراؤ اور ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونا،اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض،ان کی واضح شناخت،اغیار کے لئے سنہری موقعہ اور مسلمانوں کے زوال وادبار کا اصل سبب ہے۔قرآن کریم میں ایک طرف قرآن کو مضبوطی سے پکڑنے اور ہر شعبہ زندگی میں اس پر عمل کرنے کا حکم ہے ،دوسری طرف تفرقہ بازی سے بچنے کا حکم ہے،اس طرح یہ اشارہ کردیا گیا ہے کہ قرآن پر عمل کے نتیجہ میں اتحاد آتا ہے اور انتشار جاتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اختلاف سب سے مہلک مرض ہے اسی لئے اسلام اپنے حاملین کو ہر طرح سے اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے،اختلاف کی مذمتوں اور اتحاد کے فوائد کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہے،احادیث میں اختلافات کو ہلاکت کا سبب بتایا گیا ہے سابقہ اُمتوں کی تباہی اور بربادی کا ایک اہم سبب بھی تھا۔

تفرقہ واختلاف کا وجود لازمی ہے اس کا ذکر حدیث میں ملتا ہے: ''حضور اکرمﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ربّ سے تین دعائیں کیں دو دُعائیں قبول کرلی گئیں۔ایک دُعا قبول

نہ ہوئی میں نے اللہ سے یہ دُعا کی کہ میری اُمت کو قحط عام میں ہلاک نہ کرے، دوسری دُعا یہ کی کہ میری اُمت غرقِ آب ہلاک نہ ہو، یہ دونوں دعائیں قبول ہوگئیں، تیسری دعا یہ کی کہ مسلمان باہم ایک دوسرے نہ لڑیں، اللہ نے یہ دعا قبول نہیں کی''۔(**مسلم شریف**)

اسلاف اختلافِ اُمت کو کتنا خطرناک سمجھتے اور دُور بھاگتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی، قصر کی رخصت پر عمل نہ کیا تو اس پر صحابہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں نے منیٰ میں دو رکعت حضورﷺ کے پیچھے بھی پڑھیں اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے پیچھے بھی، اب حضرت عثمانؓ دو کی بجائے چار پڑھا رہے ہیں، لیکن پھر ابن مسعودؓ نے چار رکعت پڑھ لی اور فرمایا کہ اختلاف سے شر پیدا ہوگا، اس شر سے بچنے کے لئے دو کے بجائے چار رکعت پڑھ لی۔ (ابوداؤد شریف)

قرائن بتاتے ہیں کہ ابن مسعودؓ کا نقطہ نظر دو رکعت کی فضیلت کا تھا مگر چار کے اتمام کو بھی وہ جائز سمجھتے تھے اگر قصر واجب ہوتا تو وہ چار رکعت نہ پڑھتے اس واقعہ سے یہ اصولی ضابطہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دفع مفاسد حصول مصالح پر مقدم ہے۔حضرت ابن مسعودؓ نے اختلاف کے فساد کو دفع کرنے کے مقصد کو اتباع رسولﷺ کی مصلحت کے حصول پر مقدم رکھا۔اختلاف پیدا ہونے کے اسباب متعدد ہوتے ہیں جن میں خواہش پرستی، جہالت، بے خبری، دل کی کجی، دماغ کی عدم سلامتی، نا اہلوں سے حصول علم اور ان کی ہم نشینی، ناسمجھی، تشدد بیجا، اعتدال سے دُوری، بدعت، تعصب، غیروں کے افکار سے بے انتہا مرعوبیت و تاثر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ سے سستی وغیرہ شامل ہیں۔

اختلاف کو ختم کرنے اور اتحاد لانے کے بہت سے ذرائع و اسباب ہیں سب سے اصل و مقدم سب کتاب و سنت کا زندگیوں میں عملی نفاذ اور مضبوطی سے تھام لینا ہے، سلف صالح کے طریقہ کی پیروی، تفقہ فی الدین بھی اہم اسباب ہیں۔علمائے حق سے رابطہ اور تعلق و مجالست،

خدمت و تعظیم بھی اتحاد کا باعث ہے، علماء کو حدیث میں خیر کی کنجی اور شر کا سدباب کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ فتنوں کے ہجوم میں علمائے حق کی قربانیاں اور ثابت قدمی اور فتنۂ خلق قرآن کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی استقامت نے دینِ حق کو غلبہ و سربلندی عطا کی تھی۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ فتنوں کے عالم میں جب ہم پر شدید خوف طاری ہو جاتا تھا اور زمین تنگ معلوم ہونے لگتی تھی۔ تب ہم شیخ ابن تیمیہؒ کے پاس آتے تھے اور ان کو دیکھتے ہی اور ان کی بات سنتے ہی سارا خوف چلا جاتا تھا اور سارا غم ختم ہو جاتا ہے۔ (الوابل الصیب ۹۷)

جب تک ہر فرد پوری قوم کی اجتماعیت اور اپنی اور سب کی اصلاح کی فکر نہیں کرے گا، جب تک جزئی و فروعی اُمور میں غیر مہذب اختلاف ختم نہیں کیا جائے گا اور جب تک ہر نوع کے تعصب کو ٹھکرایا اور فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اتحاد ایک خواب رہے گا اور شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اتحاد کا وجود دینی پختگی اور صلابت پر منحصر ہے، دینی صلابت کا فقدان موجودہ اختلاف کی بنیادی وجہ ہے تحریکات، تنظیمات، مضامین و مواعظ کبھی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے اگر عملی جذبہ اُمت کے افراد میں پیدا نہ ہو سکے۔

دعائے مغفرت

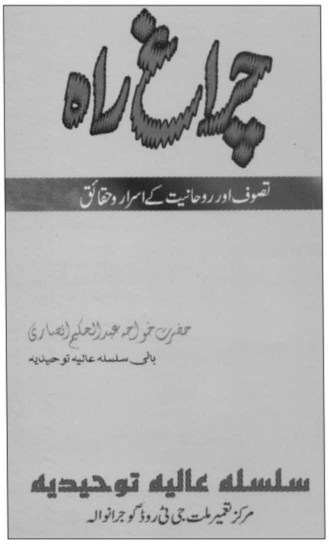
راولپنڈی سے بزرگ بھائی محمد عتیق عباسی صاحب کی اہلیہ

ملتان سے محمد فیصل خان کے بہنوئی راشد خان صاحب

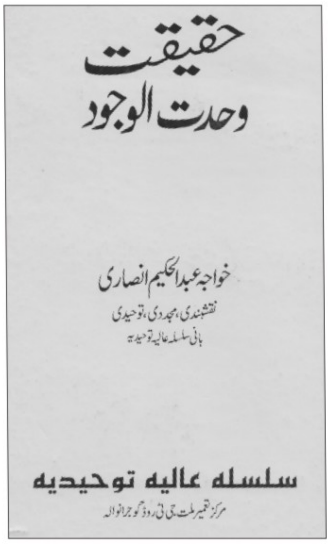
بقضائے الٰہی وفات پاگئے ہیں (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعونَ)

مرحومین کی مغفرت اور بلندی درجات کیلئے دعا فرمائیں۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔ زوال اُمت میں اُمراء، علماء، صوفیاء کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔ تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوّف کے انسانی زندگی پر اثرات۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔ مصنّفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدات کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقاء اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریۂ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظّام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

سلسلہ توحیدیہ کی مطبوعات



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات، اسلامی تصوّف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار، ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمّل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد، اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبّت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

Reg: CPL - 01
Website www.tauheediyah.com